www.urducouncil.nic.in

Azadi Ka Amrit Mahotsav

G20 भारत 2023 INDIA

اپریل 2024، قیمت:- ₹10

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

چلو ہم عید منائیں کہ جشن کا دن ہے

بچوں کے قلمکاروں کے لیے سوالنامہ

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' میں بچوں کے قلمکاروں سے انٹرویوز کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے تاکہ بچوں کو قلمکاروں اور کتابوں کے بارے میں معلومات کے ساتھ ساتھ اپنا مستقبل اور کریئر بہتر بنانے کے لیے نئی روشنی اور نئی راہ بھی مل سکے۔
یہ ادارے کی طرف سے تیار کردہ سوالات ہیں، ان کے جوابات ادب اطفال سے جڑا ہوا کوئی بھی قلمکار دے سکتا ہے۔

1 بچپن کی کون سی باتیں/شوخیاں/شرارتیں اب بھی آپ کو بہت یاد آتی ہیں؟
2 بچپن میں آپ کے پسندیدہ مصنّفین کون تھے اور اب کون ہیں؟
3 بچپن میں کس کتاب نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟
4 بچپن میں بچوں کے کون سے رسائل آپ پڑھتے تھے؟
5 بچوں کے ذہنی اور فکری ارتقا کے لیے کون سی کتابیں زیادہ مفید ہیں؟
6 زبان و بیان کو بہتر بنانے کے لیے کن مصنّفین کی کتابیں بچوں کے لیے رہنما ثابت ہوسکتی ہیں؟
7 مستقبل اور اپنے کریئر کو سنوارنے کے لیے بچوں کو کن موضوعات اور کتابوں کا مطالعہ کرنا فائدہ مند ثابت ہوگا؟

---

8 اپنے سوانحی اور تعلیمی کوائف کے بارے میں کچھ بتائیں؟
9 آپ کو بچوں کے لیے لکھنے کا خیال کب اور کیسے آیا؟
10 آپ کی پہلی تخلیق، کب اور کس رسالے میں شائع ہوئی؟
11 آپ کے مرکزی موضوعات کیا ہیں؟
12 کتاب لکھنے سے پہلے آپ بچوں کی نفسیات اور ذہنی مطالبات پر ریسرچ کرتے ہیں یا نہیں؟
13 بچوں کے لیے لکھتے ہوئے آپ کو کس طرح کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟
14 ادیب اطفال کی حیثیت سے ادبی اور علمی حلقے میں آپ کی قدر ہوتی ہے یا نہیں؟
15 کیا آپ اب بھی بچوں کے لیے لکھی گئی کتابیں پڑھتے ہیں؟
16 انگریزی اور دیگر زبانوں میں شائع ہونے والے کون سے رسالے بچوں کے لیے مفید ثابت ہوسکتے ہیں؟
17 کیا اردو میں بچوں کے لیے انگریزی، تیلگو اور دیگر زبانوں جیسا شائع ہونے والا کوئی مکمل رسالہ موجود ہے؟
18 بچوں کے ادب پر جو رسائل شائع ہو رہے ہیں، ان کے مواد اور زبان و بیان سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟
19 معاصر ادب اطفال سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟
20 بچوں کے لیے لکھتے ہوئے آج کے دور میں کن موضوعات پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے؟
21 بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کچھ مفید تجاویز اور مشورے!
22 ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' میں آپ کس نوع کی تبدیلی چاہتے ہیں؟
23 بچوں کے لیے آپ کا کوئی پیغام!

* جوابات کے ساتھ پاسپورٹ سائز تصویر اپنی کتابوں کا عکس ضرور ارسال کریں۔

اس شمارے میں

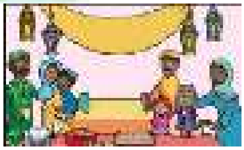

اداریہ	مدیر	04
ڈاک خانہ	قارئین	05
	مضامین	
ارادے کی فتح	عظیم اقبال	07
ابراہم لنکن کی کامیابی کے راز	افضال احمد	09
مہا کوی کالی داس	شجاع الدین شاہد	12
	چلو ہم عید منائیں کہ جشن کا دن ہے	
اوردلوں کے فاصلوں کو بھی مٹا دیتی ہے عید	عبدالغفار دانش	14
عید کی میٹھی میٹھی یادیں	رئیس صدیقی	15
کیا عیدیں تھیں اور کیا عیدی	رونق جمال	18
ایڈوانس عیدی	محمد سراج عظیم	20
مدثر کی عید	شاداب ابراہیم	23
عید پر اشعار	ادارہ	27
	انٹرویو	
کامیابی کی بلندی پر پہنچنے کا کوئی شارٹ کٹ نہیں.....	محمد رفیع انصاری	28
	نظمیں	
علم کی دولت	عطیہ پروین	32
عزم نو	رحیم رضا	33
اردو سے ہے ماں کا رشتہ	ارشاد احمد ارشاد	34
میٹھا بیر	صابر	34
پاندان	علیم طاہر	35
میں کیا چاہوں	فہیم احمد	36
	قسط وار ناول	
جنگل کی کہانی / رمیش نارائن تیواری	مترجم: زینت شہریار	37
	کہانیاں	
لوہے کی لاٹ	مختار ٹونکی	41
اپریل فول	افتخار انیس	43
ہمدردی	شاداب شمیم	46
اسکول	نازنین فردوس	49
	بار دیگر	
امتحان کی تیاری کیسے کریں	ع امیر	51
	بچوں کا کتب خانہ	
گلدستہ/ ڈاکٹر شیخ طاہرہ عبدالشکور	حقانی القاسمی	53
	سائنس نامہ	
چارلس رابرٹ ڈارون	احرار حسین	56
	واقفیت عامہ	
تاریخی، سائنسی اور ثقافتی معلومات	ادارہ	58
	ننھے فنکار	
پینٹنگ		59

بچوں کی دنیا

جلد: 12 شمارہ: 04 اپریل 2024

مدیر : پروفیسر دھننجے سنگھ

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالباری

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ تعلیم۔ محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
شعبہ ادارت: 49539009-11
ای میل
bachonkiduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: 10/ روپے، سالانہ 100/ روپے

▪ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبۂ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت
ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم
نئی دہلی-110066
فون: 26109746

ای میل: sales@ncpul.in

علاقائی مرکز: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040-24415194

پیارے بچو! انسانی زندگی میں محبت اور بھائی چارے کی بڑی اہمیت ہے۔ زندگی کو اگر پرسکون اور آرام دہ بنانا ہے تو آپس میں مل جل کر رہنا ہوگا، جس گھر اور جس ملک میں آپسی محبت اور میل ملاپ رہتا ہے اس گھر اور ملک کو ترقی کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ آپسی محبت کے فروغ کے بہت سے ذرائع ہیں ان میں سے ایک اہم ذریعہ تہوار بھی ہے۔ ہمارے ملک میں مختلف طرح کے تہوار دیوالی، ہولی، عید اور کرسمس وغیرہ منائے جاتے ہیں۔ انھی تہواروں میں عید بھی ہے۔ عید ہمارے ملک کا مشہور و

معروف تہوار ہے، یہ تہوار پورے ملک میں جوش و خروش کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ عید محبت، بھائی چارے اور اتحاد و اتفاق کا پیغام دیتا ہے۔ اس تہوار میں لوگ گلے شکوے بھلا کر ایک دوسرے کے گلے ملتے ہیں، عید کی مبارک باد دیتے ہیں اور آپس میں خوشیاں بانٹتے ہیں۔ عید میں ہر طرف محبت اور بھائی چارہ نظر آتا ہے۔ عید کا اصل پیغام محبت کو عام کرنا ہے۔ عید کا تہوار عربی مہینے کے شوال کی پہلی تاریخ کو منایا جاتا ہے۔ رمضان میں پورے مہینے روزہ رکھنے کے بعد عید آتی ہے۔ عید کی تیاری تقریباً دس دن پہلے سے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ عید کے موقعے پر بازاروں میں رونق لوٹ آتی ہے۔ بڑوں سے زیادہ بچے خوش ہوتے ہیں۔ ان کے لیے نئے نئے کپڑے سلوائے جاتے ہیں، چپل اور جوتے خریدے جاتے ہیں، بچوں کو اس بات کی بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ ان کو عیدی ملے گی، جسے وہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق خرچ کر سکتے ہیں۔

پیارے بچو! عید سب کے لیے ہے، اس لیے ہمیں بھی سب کی خوشی کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ عید کی خوشی میں غریبوں، محتاجوں اور ضرورت مندوں کو بھی شریک کرنا چاہیے، اور ان کی مدد کرنی چاہیے جس سے کہ ان کے گھر والوں کی بھی عید ہو جائے، اور عید کی اصل خوشی تو اسی میں ہے کہ سب خوش ہوں، آس پڑوس، رشتے دار اور دوست و احباب جب سب لوگ خوش ہوں گے تو عید کی خوشی دوبالا ہو جائے گی۔

بچو! آپ کے کلاس میں کوئی بچہ ایسا ہے جو ضرورت مند ہے اور اسے مدد کی ضرورت ہے تو آپ اپنے والدین سے اس کے بارے میں بات کریں، تاکہ آپ کا دوست بھی نیا کپڑا پہن سکے، آپ بھی جب اپنے لیے نئے کھلونے اور غبارے خریدیں تو اپنے ضرورت مند دوست کے لیے بھی خرید لیں، اس سے آپ کا دوست تو خوش ہوگا ہی ساتھ ہی آپ دونوں کی دوستی بھی مضبوط ہوگی۔

پیارے بچو! 'بچوں کی دنیا' کے اس شمارے میں عید کی مناسبت سے تخلیقات دی جا رہی ہیں، پہلے عید اور عیدی کے کیا معنی ہوتے تھے، عیدی کے لیے بچے کتنے پرجوش ہوا کرتے تھے، اور گاؤں میں کس طرح عید کی تیاریاں کی جاتی تھیں اور گلی محلے کو کیسے سجایا جاتا تھا اور اس موقعے پر گھروں میں کیسے کیسے پکوان پکتے تھے ان سب کا ذکر بھی ان تخلیقات میں آپ کو ملے گا۔ آپ سب کو پیشگی عید مبارک!

آپ کا

پروفیسر وجے سنگھ

ڈاک خانہ

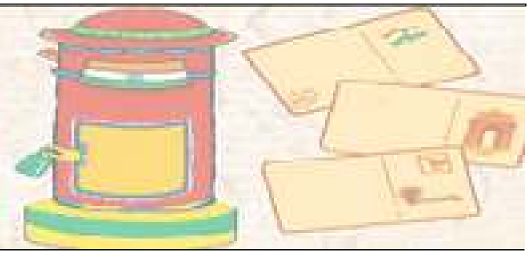

'بچوں کی دنیا' فروری کا شمارہ موصول ہوا۔ پہلی چیز جس نے میری توجہ حاصل کی وہ اس میگزین کا سرورق تھا۔ سرورق پر میوزک نوٹ کے ساتھ کتابوں کی تصاویر بہت معنی خیز ہیں۔ یہ بات قابل ستائش ہے کہ ادارے نے مرزا غالب کی برسی پر پہلا مضمون شائع کر کے انھیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ مضمون 'ہماری زندگی میں پرندوں کی اہمیت' پرندوں کی نقل مکانی کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔ موسم بدلنے پر پرندے ہجرت کرتے ہیں۔ یہ ہمیں ایک چیز بھی سکھاتا ہے، زندگی کچھ خطرات مول لینے کا نام ہے، اور خاندانی تعلقات کے لیے دورے اور چھٹیاں اچھی ہیں۔ بچوں کی نشوونما کے لیے، والدین کو ضرورت سے زیادہ حفاظت کرنے کی بجائے 'اپنے پر پھیلانے' کی اجازت دینی چاہیے۔ نظم 'موبائل' ہمارے بچوں کی صورت حال کو اچھی طرح بیان کرتی ہے۔ نظم 'چاند' ہندوستان کے چندریان مشن کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔ جناب عبدالباری کا تبصرہ 'بچوں کی مسکراہٹ' قابل تحسین ہے۔

ناہیدہ شبیر خان، پبلک ریلیشنز آفیسر، ایم ایچ ایس ایس پی، ممبئی

'بچوں کی دنیا' فروری 2024 کا شمارہ موصول ہوا۔ بہت پسند آیا۔ میں بچوں کی دنیا کا مطالعہ پابندی کے ساتھ کرتی ہوں۔ میرے طلبہ بھی اسے بے حد شوق سے پڑھتے ہیں۔ ماہ فروری کے تمام مشمولات بے حد عمدہ ہیں۔ اداریے میں 'یوم مادری زبان' اور مادری زبان کی اہمیت پر خوب لکھا ہے۔ محمد اسرار نے مضمون 'غالب کی ظرافت' میں غالب کی حس مزاح سے متعلق معلومات کو بہت عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ 'غالب اکیڈمی' سے متعلق معلومات بھی دی ہے گئی۔ مضمون 'ہماری زندگی میں پرندوں کی اہمیت' میں پرندوں کی اہمیت اور انواع و اقسام پر بہتر طریقے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ نظموں میں قلم، ممی، موبائل، چاند، میرا کوئی نہیں، جگنو اور انسان تمام نظمیں بہت خوب ہیں۔ بچوں کے قلم کاروں کا انٹرویو میرا پسندیدہ حصہ ہے۔ متین الدین کا انٹرویو اچھا لگا۔ تمام کہانیاں بھی خوب ہیں۔ میرے کچھ طلبہ اردو کہانیاں پڑھنے اور لکھنے کے بے حد شوقین ہیں۔ وہ اپنے طور پر چھوٹی چھوٹی کہانیاں تخلیق کرتے ہیں اس لیے میں نے ارادہ کیا ہے کہ میں اپنے طلبہ کو ہر ماہ بچوں کی دنیا تحفتاً دیتی رہوں گی ان شاء اللہ۔

نکہت انجم ناظم الدین، جلگاؤں مہاراشٹر

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' جنوری 2024 موصول ہوا۔ ڈائرکٹر پروفیسر دھنجے سنگھ کا اداریہ بچوں کے سنہرے مستقبل کے لیے عزم و حوصلہ بخشنے والا ہے۔ سبق آموز و گراں قدر مضامین کہانیاں، انشائیہ بعنوان 'چٹنی' جسے پڑھ کر واقعی منھ میں پانی بھر آیا۔ پان ایک ہمہ گیر طبی پودا شیخ تقدیس فاطمہ صاحبہ کے مضمون کو پڑھ کر روز ایک پان کھانے لگا ہوں۔ واقعی ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' بچوں، بڑوں کی رہنمائی کا ایک عمدہ و قابل ستائش ہے۔ مجھ ناچیز کی نظم 'تحفۂ سال نو' شائع کرنے کا شکریہ!

عبدالرزاق دل کھولاپوری، مقام و پوسٹ: کھولاپور، بھاتکولی، امراوتی، مہاراشٹر

تقدیس فاطمہ نے 'پان' کے تحت طبی نکات اور پان کی افادیت بیان کی۔ نظمیں بھی خوب ہیں بطور خاص جشن جمہوریہ، سال نو مبارک، اچھی لڑکی، شیر دہاڑا بے حد پسند آئیں۔ اردو زبان وادب کے لیے کونسل کی خدمات قابل مبارکباد ہیں۔

رحیم رضا، 2587، رضا منزل، کھرنی پورہ، یاول، جلگاؤں، مہاراشٹر

'بچوں کی دنیا' جنوری کا شمارہ موصول ہوا۔ رسالہ روز افزوں ترقی طے کر رہا ہے۔ بلاشبہ دیگر زبانوں کے رسائل میں اپنی جگہ بناتا نظر آرہا ہے۔ میں چھوٹے بچوں کی طرح نئے شمارے کا بے چینی سے منتظر رہتا ہوں اور مصروفیات سے وقت چرا کر اس کا مطالعہ کرتا ہوں۔

اداریے میں آپ نے ننھے قارئین کے سامنے بیش قیمت باتیں رکھی ہیں جو ان کے لیے کارآمد ہیں۔ عظیم اقبال نے 'قائدانہ اوصاف' کے ذریعے خوبصورت انداز میں بچوں کے قلب و ذہن میں بآسانی اتر جائے ایسے سہل طریقے سے پیش کی ہیں۔ محمد مستمر صاحب کی 'چٹنی' بھی اپنا ایک الگ مزہ دے گئی، مسلم نوبل انعام یافتگان۔ معلومات افزا مضمون ہے۔ 'اصلی آدمی' ایک منفرد انداز میں بچوں کی شخصیت کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے اہم مضمون ہے۔ محترم خیال انصاری تقریباً تین دہائیوں سے ہفت روزہ 'خیر اندیش' کے ذریعے ادب اطفال کے باغ کو سینچنے میں لگے ہیں۔ انٹرویو کے ذریعے انھوں نے اپنے بیش قیمت خیالات پیش کیے ۔

'بچوں کی دنیا' کے تمام شمارے پابندی سے پڑھ رہی ہوں۔ شمارے موصول ہوتے ہی میری تین سالہ بیٹی پہلے اس کی تمام رنگین تصاویر کا خوب غور وفکر سے معائنہ کرتی ہے۔ اس نظم نما کہانیاں بھاتی ہیں۔ اکثر و بیشتر کردار اپنے نام کی مناسبت سے متاثر کرتا ہے اس لیے بار بار کہانیاں سننے کی ضد کرتی ہے۔ فروری کے شمارے میں اشعار کا صفحہ بہت پسند آیا۔ سہل زبان میں اردو زبان سے متعلق خوبصورت اشعار جنھیں بچے آسانی سے یاد کرلیں گے۔ معلوماتی مضامین جیسے مینڈک، ٹیسٹ کرکٹ میں پہلی بار، بے موقع یا غلط استعمال ہونے والے الفاظ، تاریخی، سائنسی اور ثقافتی معلومات وغیرہ کامیاب اور اہمیت کے حامل ہیں۔ بچوں کی دنیا ہر عمر کے بچوں کی دلچسپی کا سامان رکھنے والے رسائل میں شامل ہے۔

عزہ معین، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

مضمون

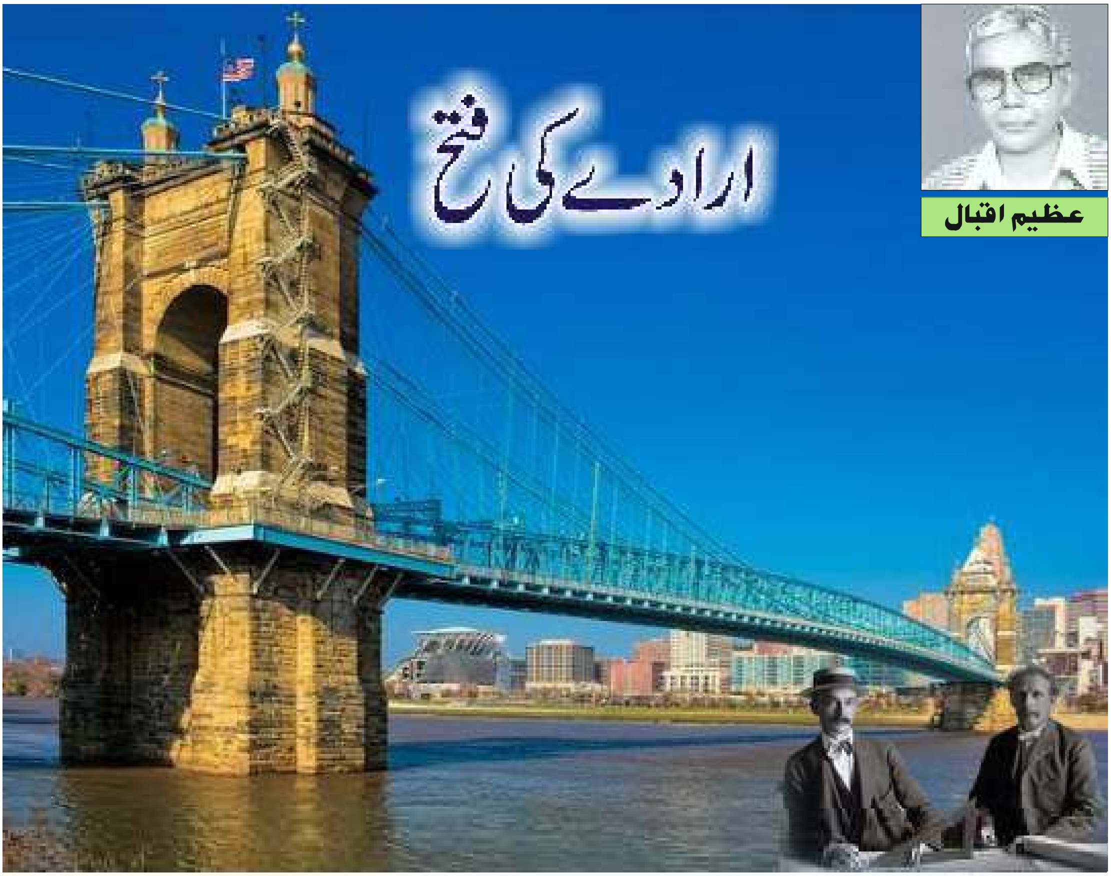

ارادے کی فتح

عظیم اقبال

ارادے کی پختگی کے بہت سارے واقعات موجود ہیں۔ یقین محکم اور عمل پیہم کی تلقین بار بار کی جاتی ہے۔ کتابوں کے صفحات ایسے کرداروں، جنھوں نے اپنی کسی معذوری کو بے بسی کا بہانہ نہیں بنایا، بھرے پڑے ہیں۔

چند نام آپ بھی جانتے ہوں گے، مثلاً مادام کیوری (Madam Curie- 1867-1934)، ہیلن ایڈمس کیلر (Hellen Adems Keller, 1880-1968) اور اسٹیفن ہاکنگ (Stephen Hawking, 1942-2018)۔

امریکہ میں 1883 کا واقعہ ہے۔ ایک تخلیقی انجینئر جس کا نام جون ربلنگ (John Roebling, 1806-69) تھا، کو خیال آیا کہ نیویارک اور لانگ آئی لینڈ (Long Island) کو ایک پل سے منسلک کیا جا سکتا ہے۔

تاہم ساری دنیا کے پل بنانے والے ماہرین کا خیال تھا کہ ایسا کرنا ناممکن ہے۔ ربلنگ سے کہا گیا کہ وہ اس خیال سے دست بردار ہو جائیں۔

ربلنگ نے اپنے ذہن میں پل کا جو خاکہ بنایا تھا، اسے ترک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے گہرائی سے غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ایسا کیا جا سکتا ہے۔

اپنے اس خواب کو وہ کسی دوسرے کے ساتھ مل کر پورا کرنا چاہتا تھا۔ بہت غور و فکر کے بعد اس نے اپنے بیٹے واشنگٹن (Washington) جو ایک ابھرتا ہوا انجینئر تھا، کو یقین دلایا کہ پل کو واقعتاً تعمیر کے مرحلے سے گزارا جا سکتا ہے۔

پہلی دفعہ ایک ساتھ کام کرتے ہوئے باپ، بیٹے نے مشکلیں دور کرنے اور پل کی تعمیر کرنے کو طے کر لیا۔ ان میں بڑا جوش اور جذبہ تھا۔ ایک چیلنج تھا، لیکن ایک تحریک بھی تھی۔ اس کے تحت انھوں نے کچھ کاریگر بدل لیے اور اپنے خواب کی تعبیر کی ابتدا کر دی۔

کام بخوبی شروع ہوا۔ ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے کہ کام کی جگہ پر ایک سانحہ ہو گیا جس میں رہبلنگ کی جان چلی گئی۔ واشنگٹن بری طرح زخمی ہو گئے۔ ان کے دماغ کا کچھ حصہ ناکارہ ہو گیا۔ وہ چل نہیں سکتے تھے، ہلنے ڈولنے کے اہل نہ تھے۔ وہ بات بھی نہیں کر سکتے تھے۔

"ہم نے پہلے ہی کہا تھا"

"خبطی لوگ، اور خطرے سے بھرا منصوبہ۔"

"یہ خطرناک کام کرنا بے وقوفی ہے۔"

ہر کوئی رائے زنی کر رہا تھا، جس میں نفی کا پہلو تھا۔ سب کا خیال تھا کہ منصوبہ ترک کر دیا جائے، کیونکہ اس پل کی تعمیر کے منصوبے سے رہبلنگ اور واشنگٹن ہی واقف تھے۔

اپنی معذوری کے باوجود واشنگٹن نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ اس پل کی تعمیر کو مکمل کرنے کے خواہاں تھے۔

ان کی سوچ پہلے جیسی ہی تھی۔ انھوں نے کوشش کی کہ اپنے کچھ رفقا کو اپنے جذبے سے تحریک دیں، لیکن وہ سب اس کام کے بکھیڑے دیکھ رہے تھے۔

وہ شفاخانے کے ایک کمرے میں بستر پر پڑے تھے۔ ان کے اندرون شعور نے انھیں پست ہمتی سے روکا۔ اچانک ایک خیال ان کے ذہن میں ابھرا۔ ان میں بس اتنی اہلیت تھی کہ اپنی ایک انگلی کو حرکت دے سکیں۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کا بھرپور استعمال کریں گے۔

اپنی انگلی کو حرکت دے کر انھوں نے اپنی اہلیہ کے ساتھ ترسیل (Communication) کے لیے ایک خفیہ اشارے (Code) کو فروغ دیا۔

اسی انگلی سے انھوں نے اہلیہ کا بازو مس کیا۔ منشا یہ تھا کہ انجینئر دوبارہ بلائے جائیں۔ انھوں نے اس طریقے کو استعمال کر کے اہلیہ کو بتایا کہ انجینئر کیا کریں۔ یہ احمقانہ کام لگتا تھا، لیکن منصوبہ دوبارہ شروع ہو گیا۔

تیرہ برسوں تک واشنگٹن اپنی ہدایتیں اپنی انگلی سے اہلیہ کے بازو پر دیتے رہے۔ آخر کار پل مکمل ہو گیا۔

آج مذکورہ قابل دید پل پوری آن بان کے ساتھ کھڑا ہے اور ایک شخص کی زبردست قوت ارادی کی یاد دلاتا ہے۔ وہ شخص جس نے حالات کے سامنے سر نہ جھکایا۔ یہاں انجینئروں کی ٹیم کے تئیں بھی ایک اظہار عقیدت ہے۔ جنھوں نے ایک شخص پر بھروسہ کیا، جسے دوسرے بیشتر خبطی سمجھتے تھے۔

یہ پل یادگار ہے، اس خاتون کی بھی، جس نے 13 برسوں تک صبر کے ساتھ اپنے شوہر کی ترسیلات کو بخوبی سمجھ اور انجینئروں کو بتایا کہ وہ کیا کریں۔

یہ ایک بہترین مثال ہے کہ کبھی حالات کے سامنے سر خم نہ کریں اور ناممکن سمجھے جانے والے مقصد کو صبر سے پورا کریں۔

عزیز دوستو! ایسے سارے لوگ جنھوں نے اپنے خیال، ارادے اور عمل سے ہمیں مستفید کیا ہے، قابل رشک ہیں۔ ان کی زندگی ہمارے لیے باعث تحریک ہے۔ آئیے، ہم سب ان سے استفادے کا عہد کریں!

■

Azim Iqbal
Adabistan, Ganj - I
Bettiah - 845439 (Bihar)
Mob.: 9006502649

افضال احمد

ابراہم لنکن کی کامیابی کے راز

ریاستہائے متحدہ یعنی امریکہ کے 16 ویں صدر ابراہم لنکن کو تاریخ کے عظیم اور اعلیٰ ترین رہنماؤں میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ 12 فروری 1809 کو کینٹکی کے ہوڈ گن وین کے قریب سنکنگ اسپرنگ فارم کے ایک لاگ کیبن میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ تھامس لنکن اور نینسی ہینکس لنکن کی دوسری اولاد تھے۔ اس غیر معمولی صدر کے بارے میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کی عظمت کے راستے میں سب کچھ غیر معمولی تھا۔ ایک متوسط طبقے کا شخص آخر کس طرح زمین سے اُٹھ کر دنیا کے ایک طاقتور ملک کا صدر بن گیا، یہ جاننا واقعی دلچسپ ہوگا۔ یہاں ہم لنکن کی زندگی پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے، یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ روایتی راستے پر چلے بغیر عظمت کیسے حاصل کی جا سکتی ہے۔

1 خود سیکھنے والے شخص

لنکن، جس نے اپنے بچپن کا بیشتر حصہ اپنے والد کے ساتھ کھیت میں کام کرتے ہوئے گزارا، فارغ وقت میں خود تعلیم حاصل کی۔ اس نے اپنا ہوم اسکول بنایا۔ اس کے اساتذہ، پڑوسی اور اس کی سوتیلی ماں، جو اس کے سیکھنے کی پیاس سے آگاہ تھے، نے اس کے ہوم اسکول کے لیے مفت کتابیں فراہم کیں۔ ان کتابوں کو پڑھنے کے لیے جب اس کے گھر میں روشنی کا مسئلہ ہوتا تھا، تو وہ اسٹریٹ لائٹ کا استعمال کرتے ہوئے پڑھتا تھا۔ غربت میں پرورش پانے والے لنکن نے اپنی زیادہ تر تعلیم گھر پر خود مطالعے کے ذریعے حاصل کی۔ جہاں تک اسکولنگ کا تعلق ہے، اس نے کسی بھی قسم کے رسمی اسکول میں صرف 12 ماہ گزارے ہوں گے۔ وہ

ایک غیر روایتی سیکھنے والا لڑکا تھا۔ اس غیر روایتی طریقے سے نوجوان لنکن نے نہ صرف پڑھنا، لکھنا اور ریاضی سیکھی بلکہ قانونی بحث ومباحثے کی مہارت بھی حاصل کی۔ وہ شاید تاریخ کا واحد شخص ہوگا، جس نے کبھی کسی قانون کے اسکول میں پڑھائی نہ کی، اس کے باوجود اس نے الینوائے بار میں پریکٹس کی اور بالآخر ریاستہائے متحدہ امریکہ کا صدر بن گیا۔

2 پڑھنا کبھی بند نہ کریں

علم حاصل کرنے کے لیے ابراہم لنکن نے غیر معمولی کوششیں کیں۔ اپنے بہت سے اہداف حاصل کرنے کے بعد بھی لنکن نے علم کی جستجو کو ترک نہیں کیا۔ صدر کے طور پر اس نے لائبریری آف کانگریس میں باقاعدگی سے کتب جمع کی اور اپنی علمی پیاس بجھائی۔ اسے اکثر اخبارات اور کلاسیکی کتابیں پڑھتے ہوئے دیکھا جاتا تھا۔ لنکن کے اس شوق نے ہمیں سمجھایا کہ نہ صرف کسی درجے کو پاس کرنے بلکہ زندگی بھر سیکھتے رہنے اور تفریح کے لیے بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

3 کچھ نیا کرنے کی کوشش کریں

لنکن نے اس ٹیکنالوجی کو اپنایا جو اس کے پاس اس وقت دستیاب تھی، جس سے وہ ٹیلی گراف (اپنے وقت کا انٹرنیٹ) استعمال کرنے والا پہلا صدر بن گیا۔ مورخین کا کہنا ہے کہ لنکن نے ٹیلی گراف کا استعمال جرنیلوں کے ساتھ بات چیت کے لیے کیا، جیسے کہ آج ہم ای میل استعمال کرتے ہیں۔ لنکن کی زندگی سے جو سبق ہم سیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ کوئی تجربہ یا کوئی غیر مانوس کورس سیکھنے کے لیے ہمیں اپنی آرام دہ زندگی جتنی کم کرنی پڑے، زندگی میں ہمیں اتنا ہی زیادہ فائدہ ہوگا۔

4 حسِ مزاح بھی ضروری ہے

انتہائی مشکل اور شدید حالات میں بھی، لنکن اپنے ہوش وحواس کو برقرار رکھنے کے لیے جانا جاتا تھا۔ الینوائے ریاستی ہم کے دوران: اسٹیفن اے ڈگلس کے ساتھ بحث کے وقت، لنکن کے مخالف نے اس پر دو چہرے والا ہونے کا الزام لگایا۔ اپنی ظاہری شکل کا مذاق اڑائے جانے پر کوئی دباؤ محسوس کرنے یا پریشان ہونے کے بجائے، لنکن نے مذاق کرتے ہوئے کہا: ''سچ کہوں! اگر میں دو چہرے والا ہوتا، تو کیا میں تمہیں یہ دکھاتا؟'' یہ واقعہ ہمیں سکھاتا ہے کہ مشکل حالات میں بھی ہمیں اپنی حسِ مزاح کو نہیں کھونا چاہیے۔ اسی طرح طالب علمی کی زندگی میں پڑھتے وقت آرام کرنا اور درمیان میں ہنسنا ہنسانا نہ بھولیں۔ اس سے تناؤ کم ہوتا ہے۔

5 مختلف ہونے کی ہمت کریں

لنکن ہمیشہ اپنی ایمانداری اور اختراع پر آمادگی کے لیے جانا جاتا تھا، کچھ اخباری کالم نگاروں نے انتہائی کرامر بولنے میں اس کی نااہلی کا مذاق اڑایا۔ لیکن لنکن اپنے ناقدین کے سامنے ڈٹا رہا اور اپنے عقیدے پر قائم رہا۔ اس انداز نے اسے ہمیشہ مقبول بنایا۔ اس کا یہ نقطہ نظر ہمیں سکھاتا ہے کہ ہمیں اپنے ناقدین کے سامنے بھی ثابت قدم رہنا چاہیے اور اگر ہم جانتے ہیں کہ ہم صحیح ہیں تو اس پر قائم رہیں۔ اپنی بھیڑ سے ہٹ کر کچھ نیا کرنے کی ہمت کریں۔

6 ناکامی میں بھی کامیابی کی تلاش

1858 میں ابراہم لنکن نے سینیٹر کے لیے اسٹیفن اے ڈگلس کے خلاف انتخاب لڑا۔ وہ الیکشن ہار گیا۔ صرف ایک بار نہیں وہ دو بار سینیٹ انتخابات میں ناکام رہا۔ لیکن ڈگلس کے ساتھ بحث کرتے ہوئے اس نے جو قومی شہرت حاصل کی، اس نے 1860 میں ریپبلکن پارٹی سے اس کی صدر کے لیے نامزدگی کی راہ ہموار کی۔ لنکن کی یہ کامیابی ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ ناکامی بھی ہمیں بہت کچھ دے کر جاتی ہے۔ اس لیے ہمیں ناکامیوں سے گھبرانا نہیں چاہیے، کیونکہ ان سے

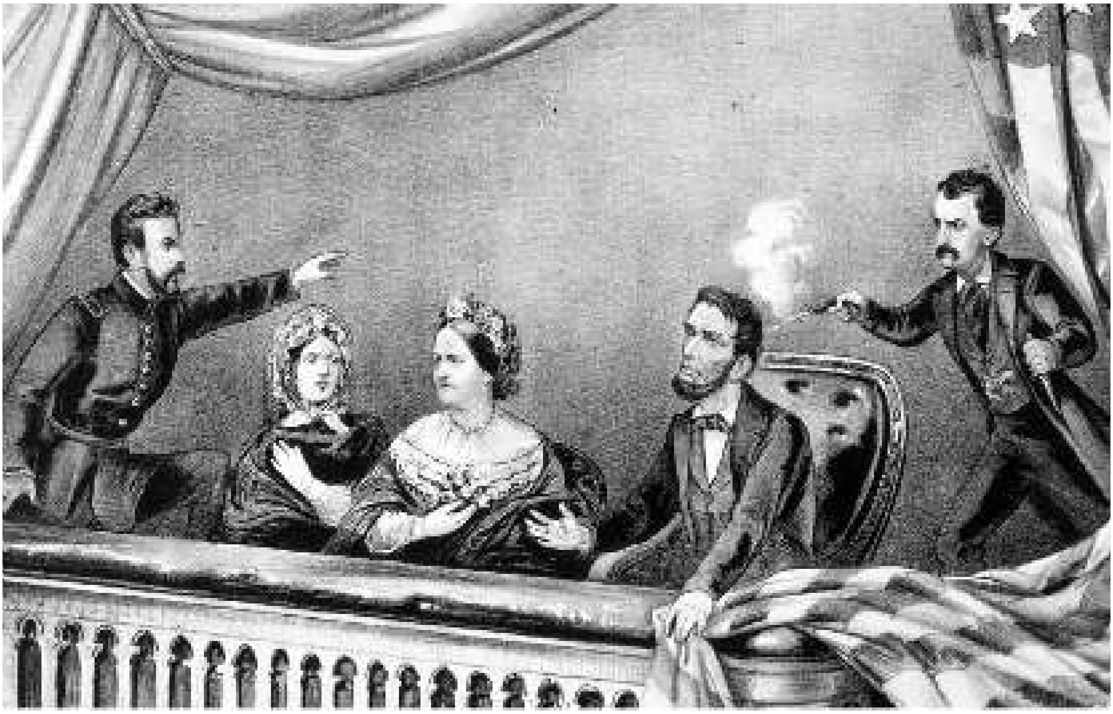

سے سبق اور تجربہ ہے۔ ہم کو اس سے بھی بڑی کامیابی تک پہنچنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

7 جہد مسلسل

لنکن کی جدوجہد میں منہمک رہنے کی عادت سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ بچپن میں وہ اپنی تعلیم کو لے کر جدوجہد کرتا نظر آتا ہے، پھر ایک جنگجو کے طور پر جب اس نے اپنی زندگی شروع کی تو بیک ہاک جنگ میں کپتان بھی رہا۔ آٹھ سال الینوائے کی مقننہ میں گزارے اور کئی سالوں تک عدالتوں میں بھی کام کیا۔ وہ ایک وکیل، الینوائے ریاست کے قانون ساز اور امریکی ایوان نمائندگان کا رکن بھی رہا۔ ہمہ وقت کام میں لگے رہنے کی اس کی عادت کے بارے میں اس کے لا پارٹنر کا کہنا تھا کہ "لنکن ایک چھوٹا سا انجن ہے، جو کبھی آرام نہیں کرتا"۔ لنکن کی یہ خاصیت ہمیں بتاتی ہے کہ اگر ہم نتائج کی پرواہ کیے بغیر اپنی کوششوں میں منہمک رہیں، تو کامیابی خود بخود ہمارے قدم چومتی ہے۔

ابراہم لنکن کی ایک بہت بڑی کامیابی یہ رہی کہ اس نے امریکہ کو سب سے بڑے بحران 'خانہ جنگی' سے باہر نکالا۔ امریکہ میں غلامی کے خاتمے کا سہرا بھی ابراہم لنکن کو ہی جاتا ہے۔ اس سب میں وہ جنوبی امریکہ کے لوگوں کے نشانے پر آ گیا۔ 14 اپریل 1865 کو گڈ فرائیڈے کے موقعے پر، واشنگٹن کے فورڈ تھیٹر میں ایک اداکار، جان ولکس بوتھ نے ابراہم لنکن کو قتل کر دیا۔ بوتھ کا خیال تھا کہ وہ جنوب کی مدد کر رہا ہے۔ بوتھ کے اس قدم سے امریکہ اپنی ایک اہم شخصیت سے محروم ہو گیا۔

■

Afzal Ahmad
Asst. Teacher
65, Ghalib Nagar
Firozabad - (UP)
Mob.: 9412166498

مضمون

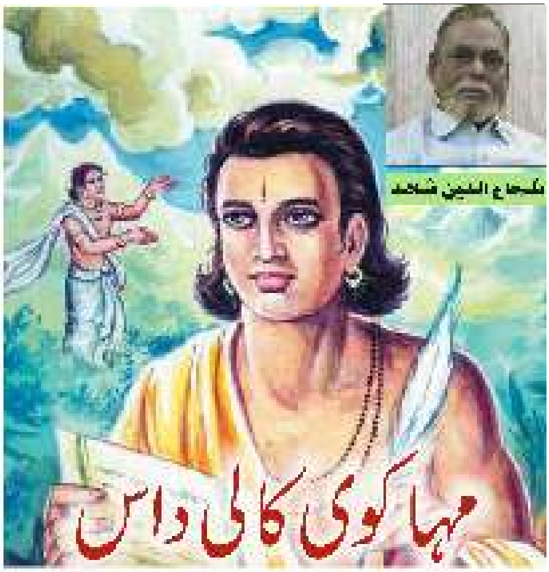

مہا کوی کالی داس

شجاع الدین شاہد

بھارت دیش زمانہ قدیم سے ہی سنتوں اور صوفیوں کی سرزمین رہا ہے۔ یہاں ایسے ایسے انمول رتن پیدا ہوئے جنھوں نے زبان وادب کے علاوہ دیگر میدانوں میں بھی قابل فخر کارنامے انجام دیے ہیں۔ سماجی مصلح کے طور پر تو کبھی اپنے قلم کی بدولت سماج سے برائیوں کو ختم کرنے کی کوششیں اور اچھائیوں کو پروان چڑھانے کا کام کیا۔

جس طرح انگریزی ادب میں شیکسپیئر، ہندوی میں امیر خسرو، اردو میں مرزا غالب، ہندی میں رس خان کو جو درجہ حاصل ہے وہی درجہ سنسکرت میں کالی داس کو حاصل ہے۔

تو بچو! آج ہم سنسکرت کے اہم شاعر و ڈراما نگار مہا کوی کالی داس کے چند بے واقعات کا ذکر کرتے ہیں۔

کالی داس کی جائے پیدائش کے تعلق سے مؤرخین میں اختلافات ہیں۔ کسی نے ان کے اجین میں پیدا ہونے کا ذکر کیا ہے تو کسی نے اتراکھنڈ میں۔ بچپن میں ہی والدین کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا۔ بچپن چرواہے کے طور پر گزرا۔ وہ شکل وصورت کے اعتبار سے بڑے خوبصورت تھے مگر دماغی طور پر کمزور تھے مگر قدرت نے ان میں کوٹ کوٹ کر ذہانت بھر دی تھی۔ ضرورت تھی کہ کوئی پارکھی ان کی صلاحیت کو پرکھے اور انھیں تراش کر پتھر سے انمول ہیرا بنا دے۔

اجین کے راجا کی راجکماری 'ودیوتما' بڑی خوبصورت اور ذہین تھی۔ اس نے اپنی شادی کے لیے شرط رکھی کہ جو کوئی اس کے سوالوں کا جواب اشاروں اشاروں میں دے گا وہ اسی سے شادی کرے گی۔ چنانچہ بھارت دیش سے بڑے بڑے پنڈت اور عالم لوگ جمع ہوئے مگر کوئی بھی ان کے سوالوں کا جواب نہیں دے پایا۔ راجکماری نے سبھی کو رد کردیا۔ خواہش مند عالموں نے جو راجکماری سے شادی کرنے آئے تھے مایوس ہوئے اور انھیں ہتک محسوس ہوئی۔ انھوں نے راجکماری سے بدلہ لینے کی ٹھانی اور سوچا کہ شہزادی کا گھمنڈ توڑنے کے لیے کسی ان پڑھ سے اس کی شادی کرادی جائے۔ جب یہ لوگ جنگل سے گزر رہے تھے تو انھوں نے دیکھا کہ ایک شخص ایک ٹہنی پر بیٹھا ہوا اسی ٹہنی کو کاٹ رہا ہے۔ انھوں نے سوچا کہ یہ شخص بیوقوف لگتا ہے۔ کیوں نہ اس سے ہی راجکماری کی شادی کرادی جائے۔ یہ شخص کوئی اور نہیں کالی داس تھے۔ چنانچہ ان کو تیار کرکے راج محل لے جایا گیا اور سمجھایا گیا کہ اشاروں اشاروں میں ہی جوابات دینے ہیں۔ تمھارے جوابات کا مطلب ہم شہزادی کو سمجھا دیں گے۔ راج محل سجایا گیا اور اشاروں ہی اشاروں میں شہزادی نے سوالات کیے۔

راجکماری نے پہلے سوال کے طور پر کالی داس کو ایک انگلی دکھائی۔ کالی داس نے اسے دو انگلیاں دکھائی۔ پھر شہزادی نے اپنا پنجہ دکھایا۔ جواب میں کالی داس نے اسے گھونسا دکھایا۔ وہاں موجود پنڈتوں نے شہزادی کو ان سوالوں کا جواب، جو کہ کالی داس نے اشاروں میں دیا تھا، کی ترجمانی شہزادی کے مرضی کے عین مطابق کی۔ جس سے شہزادی خوش ہوئی اور کالی داس سے اس کی شادی ہوگئی۔ چونکہ راجکماری سنسکرت کی ایک

عام تھی۔ اُسے پتا چلا کہ یہ تو ان پڑھ کند ذہن ہے۔ اس نے انھیں گھر سے نکال دیا اور کہا کہ جب تک تم گیانی نہیں بن جاتے تب تک میرے دروازے پر مت آنا۔

اس واقعے کا کالی داس پر بڑا اثر ہوا۔ انھیں بڑی بے عزتی محسوس ہوئی اور اسی ایک واقعے نے ان کی زندگی بدل کر رکھ دی۔ وہ علم کی تلاش میں نکل پڑے۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ سنسکرت زبان میں انھوں نے دسترس حاصل کر لی۔ اس کے بعد وہ واپس لوٹ آئے اور اپنی پتنی ودّھوتما کے دروازے پر یہ بول کر دستک دی: "اے حسینہ دروازہ کھولو"۔

سنسکرت میں اتنا شائستہ اور خالص جملہ سن کر راجکماری چونک گئی۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا سامنے کالی داس کو کھڑا پایا۔ پھر کالی داس کی عالمانہ گفتگو اور لہجے سے اتنا متاثر ہوئی کہ راجکماری نے انھیں اپنا گرو ہی نہیں پتی بھی مان لیا۔

بھارت کی تاریخ میں راجا بھوج اور کالی داس بہت مشہور ہوئے۔ راجا بھوج سنتوں، دانشوروں، شاعروں اور فقیروں کی بڑی قدر کرتا تھا اور اپنے دربار میں ان کی عزت اور احترام میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا تھا۔

ایک دفعہ کالی داس ایک سادھو نما فقیر کا بھیس اختیار کر کے راجا بھوج کے دربار میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے اپنے کاندھے پر ایک جھولی لٹکا لی تھی جو جگہ جگہ سے بوسیدہ تھی۔ اس جھولی میں بڑے بڑے سوراخ پڑے ہوئے تھے۔ راجا بھوج کی نظر جھولی پر پڑی۔ وہ کالی داس کو پہچان نہیں پایا۔

راجہ بھوج: سادھو مہاراج! تمھاری جھولی میں تو جگہ جگہ چھید اور سوراخ پڑے ہوئے ہیں اور یہ بہت پھٹی ہوئی ہے۔

سادھو: مہاراج یہ جھولی نہیں مچھلی پکڑنے کا جال ہے۔

راجہ: ارے تم مچھلی کھاتے ہو؟

سادھو: شراب نوشی کے بعد مچھلی کھانی پڑتی ہے۔

راجہ: تم شراب بھی پیتے ہو؟

سادھو: رات میں جب چوری کرنے جاتا ہوں تو شراب کا نشہ ضروری ہوتا ہے۔

راجہ: ارے تم چوری بھی کرتے ہو؟

سادھو: اگر چوری نہیں کروں گا تو جوا کھیلنے کے لیے پیسہ کہاں سے آئے گا۔

راجہ: اے پاپی سادھو! اتنی ساری خرابیاں تجھ میں کہاں سے آ گئیں؟

سادھو نے نرم لہجے میں راجا بھوج سے مخاطب ہو کر کہا:

"مہاراج اپنے اندر ایک خرابی آنے سے ساری خرابیاں، برائیاں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ جیسے میری جھولی میں ایک سوراخ تھا مگر دھیرے دھیرے وہ سوراخ بڑا ہوا اور کئی سوراخ اس جھولی میں پڑ گئے۔ اسی طرح ہماری زندگی بھی ہے اگر ایک چھوٹی برائی اپنے اندر آ جائے تو وہ بڑی ہو جاتی ہے جیسے ایک چھوٹا سا زخم ناسور بن جاتا ہے۔ بہتر ہے اس برائی کو ابتدا ہی میں ختم کر دیا جائے۔"

سادھو نما فقیر کی یہ باتیں سن کر راجا بھوج حیرت زدہ رہ گیا اور جب اسے پتہ چلا کہ یہ سادھو فقیر کوئی اور نہیں بلکہ مہا کوی کالیداس ہے تو وہ بڑا متاثر ہوا اور ان سے بغل گیر ہو گیا۔

تو بچو! سوچو تمھیں کیا کرنا ہے۔ علم حاصل کرنے کے لیے تمھیں ہر راہ سے گزرنا ہے۔ کوئی برائی اپنے اندر آنے سے پہلے ہی اسے ختم کر دینا ہے۔

■

Shujauddin Shahid
Room No. 5, Plot No. 1, Swambhu CHS
Near Care Hospital
Malwani, Mhada, Malad (West)
Mumbai - 400095 (Maharashtra)
Mob: 9969039485

ہر در و دیوار کی رونق بڑھا دیتی ہے عید
زندگی کیا ہے ہمیں آ کر بتا دیتی ہے عید

باہمی رفق و محبت کا پتا دیتی ہے عید
نفرت و بغض و حسد دل سے مٹا دیتی ہے عید

دامنِ رحمت کو اپنے کھول دیتا ہے خدا
مومنوں پر برکتیں اپنی لٹا دیتی ہے عید

یہ مصافحے، یہ بغل گیری، سویاں، فیرنی
امن کا پیغام اور درسِ وفا دیتی ہے عید

بھول جاتے ہیں آج ہم اپنے گلے شکوے سبھی
فرقِ رنگ و نسل بھی یکسر مٹا دیتی ہے عید

اقربا کی دید ہی کی ہی خوشی ہے عید کی
جو وطن سے دور ہیں ان کو رلا دیتی ہے عید

زندگی، زندہ دلی کا بھی سبق دیتی ہے یہ
بے وفا لوگوں کو بھی درسِ وفا دیتی ہے عید

شہر و قصبہ ہو کہ وہ چھوٹا سا کوئی گاؤں ہو
ہر جگہ اک شادمانی کی فضا دیتی ہے عید

صاحبانِ مال و زر کو ہی نہیں رونق ہے کوئی
خستہ حالوں کا بھی منہ میٹھا کرا دیتی ہے عید

ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی بھی گلے ملتے ہیں خوب
پیار اور انسانیت کا آئینہ دیتی ہے عید

کتنا پیارا ہے نظامِ صدقہ و عشر و زکوٰۃ
مفلس و قلاش کو اوپر اٹھا دیتی ہے عید

بارگاہِ ایزدی میں سر جھکاتے ہیں میاں
عاجزی اور انکساری کو بڑھا دیتی ہے عید

ہے صدا اللہ اکبر کی گلی کوچوں میں آج
جذبۂ توحید ہر دل میں جگا دیتی ہے عید

دے رہے ہیں عید کے دن سب مبارکبادیاں
اور دلوں کے فاصلوں کو بھی مٹا دیتی ہے عید

ہے خدا راضی تو دانش روز روز عید ہے
وہ اگر راضی نہیں تو کیا مزہ دیتی ہے عید

■

Abdul Ghaffar Danish Siddiqui
Mohalla Islam Nagar (Teli Pura)
At & PO: Noor Pur 246734
Distt.- Bijnor (UP)
Mob.: 9897565066

عید کی میٹھی یادیں

رئیس صدیقی

ہمیشہ مجھے لکھنؤ میں گزرے اپنے بچپن کی عید کی میٹھی میٹھی یادیں اور باتیں یاد آتی رہتی ہیں یا یوں کہیں کہ عید کا ذکر ہوتے ہی کچھ میٹھی میٹھی یادیں ذہن کے کسی کونے میں رقص کرنے لگتی ہیں اور دل چاہتا ہے کہ ان مسرت آمیز یادوں کو آپ کے ساتھ شیئر کروں، ساجھا کروں کیونکہ یہ یادوں کی برات میری زندگی کا خوبصورت اور بیش بہا سرمایہ ہے۔

ہمارے بچپن میں خوشی کے خاص موقعوں میں رمضان اور عید بہت اہم تھے۔ رمضان کے پہلے عشرے سے ہی چھوٹی چھوٹی خواہشیں سر ابھارنے لگتی تھیں۔ والدین بھی اپنے بچوں کے لیے پہلے خریداری کرتے۔ اپنے اپنے قریبی عزیزوں کے لیے بعد میں سوچتے۔ ہم بھی اچھی سی پینٹ، رنگین شرٹ، فیشن کے حساب سے نئے جوتے یا نئے ڈیزائن کی چپل، رنگین موزے، براؤن بیلٹ، کریم رنگ کی شیروانی، سفید کرتا، پاجامہ، رومال اور ٹوپی کے لیے امید لگائے رکھتے۔ جن والدین کی آمدنی کچھ زیادہ ہوتی وہ الوداع یعنی رمضان کے آخری جمعے اور عید کی نماز کے لیے بھی کپڑے خریدتے اور درزی سے آخری جمعہ اور عید سے پہلے دینے کا اصرار کرتے۔ درزی بھی اپنے ہر گاہک کو یقین دلاتا کہ وہ عید سے پہلے کپڑے سی کر دے دے گا۔ ہم بھی اس پر یقین کر لیتے کیونکہ ہمارے بچپن میں ریڈی میڈ یا سلے سلائے پوشاک کا تصور بھی نہ تھا لیکن مجھے یاد ہے کہ کئی بار عید کا چاند رمضان کی انتیس تاریخ کو نکلا تو کپڑے عید کی نماز کے بعد ہی ملتے، وہ بھی درزی کی بہت خوشامد کرنے کے بعد۔

بہر حال، ہمارے بچپن میں نئے کپڑے ملنے کے مواقع بہت کم ہوتے تھے۔ عید الفطر بچوں کے لیے نئے نئے کپڑے ملنے کا ایک سنہرا اور قیمتی موقع ہوتا تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر، عیدی کے پیسے ہوتے جو کئی دنوں تک اور اگر زیادہ عیدی مل گئی تو کئی ہفتوں تک، اپنی پسند کی آئس کریم، برف کے گولے، قلفی، کھٹے میٹھے کیپٹ، رس بھری، سنترے کی گولیاں، کھٹی میٹھی چورن کی گولیاں، ٹافی، لالی پاپ، رنگ برنگا شربت، غبارے، ہوا والی چرخی، آواز والی پھونکی، ربڑ اور مٹی کے چھوٹے چھوٹے کھلونے، رنگ برنگی پتنگیں اور کئی قسم

کی ڈور اور بچوں کی کہانیوں کی کتابیں خریدنے پر صرف ہوتے۔

انتیس روزے پورے ہونے کے بعد اور اگر اس دن عید کا چاند نظر نہیں آتا تو تیس روزے مکمل ہونے کے بعد، عید کا چاند دیکھنے کے لیے ہم بچے، جوان، بوڑھے مرد و عورت یعنی گھر کے سبھی لوگ اپنے اپنے گھروں کی چھت پر یا آنگن میں اکٹھا ہو کر بڑی بے تابی سے آسمان پر عید کا دلکش باریک چاند دیکھنے کی چاہت میں جمع ہوتے۔ اگر انتیس ہی روزہ مکمل ہونے کے بعد، عید کا چاند نظر آتا تو ہم بچوں کو بے حد خوشی ہوتی کہ کل عید ہے۔

بہر حال، عید کا چاند نظر آنے پر، ہم سبھی لوگ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے دعا مانگتے اور سبھی چھوٹے اپنے بڑوں کو سلام کرتے اور بڑے اپنے چھوٹوں کو ان کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے دعائیں دیتے۔ ہم عمر ایک دوسرے سے گلے ملتے اور ایک دوسرے کو چاند رات کی مبارکباد پیش کرتے۔

اگر انتیس تاریخ کو چاند نظر نہیں آتا تو شہر یا علاقے کی چاند کمیٹی کی طرف سے ہمیں اعلان کا انتظار رہتا کہ چاند نظر آیا یا نہیں کیونکہ اکثر آسمان پر بادل چھائے رہنے کی وجہ سے باریک سا چاند، (ہلال) نظر نہیں آتا۔ ہم کافی رات تک اعلان کا انتظار کرتے رہتے اور اللہ سے دعا بھی کرتے رہتے کہ جلدی سے کل عید ہو جائے!

عید کا چاند نظر آنے پر، گھر کے ذمے دار لوگ عید کی بچی کچھی تیاری میں لگ جاتے۔ اگر گھر میں کوئی سامان کم ہوتا تو بازار جاتے اور ضروری سامان کی خریداری کرتے۔ بازاروں میں چاند رات کو بہت بھیڑ ہوتی اور بازار کافی رات تک کھلے رہتے۔

ادھر گھروں میں عید کے دن کے لیے طرح طرح کے پکوانوں کی تیاری شروع ہو جاتی۔ ہم بچے اپنے بڑوں کے ساتھ عید گاہ جانے کے لیے رات کو ہی اپنے نئے نئے کپڑے صبح پہننے کے لیے نکال کر رکھ دیتے۔ مہمانوں کے لیے ٹیبل پر صاف ستھرے خاص برتن وغیرہ نکال کر سلیقے سے سجائے جاتے۔ غرض کہ عید کی تیاری میں کافی رات ہو جاتی۔

صبح عید کی صبح، سبھی لوگ جلدی اٹھتے۔ کوئی غسل کرنے میں مصروف ہوتا تو کوئی شیر خورمہ، تو کوئی قوامی اور دودھ سوئیاں تیار کر رہا ہوتا کیونکہ عید کی دو رکعت شکرانے کی نماز ادا کرنے کے لیے عید گاہ یا جامع مسجد یا قریب کی جمعہ مسجد جانے سے پہلے، ناشتے میں کم سے کم، شیر خورمہ یا قوامی سوئیاں یا شیر سوئیوں کا ناشتہ ضرور کرایا جاتا یعنی ہم گھر سے منہ میٹھا کر کے ہی نکلتے۔

عید گاہ میں نماز ادا کرنے کے لیے والد صاحب ساتھ میں جا نماز یا چادر وغیرہ ضرور ساتھ لے جاتے۔ والد صاحب عید کی دو رکعت شکرانے کی نماز سے قبل، گھر کے ہر فرد کی طرف سے مقررہ فطرے کی رقم غریبوں میں تقسیم کرتے تاکہ غریبوں کو بھی عید کی خوشی حاصل ہو اور وہ بھی ہماری طرح عید منا سکیں۔

ابو جان عید گاہ عید کی نماز کے لیے ایک راستے سے جاتے اور دوسرے راستے سے واپس آتے۔

وہ راستے میں ہمیں نصیحت کرتے ہوئے بتاتے کہ اس میں سماجی حکمت یہ ہے کہ عید گاہ یا جامع مسجد یا جمعہ مسجد گھر سے کافی دور ہوتی ہے۔ لہٰذا راستے میں پڑنے والی آبادی کو دیکھو۔ اگر عزیز یا رشتے دار یا جان پہچان کے لوگ رہتے ہیں تو ان سے ملاقات کرو۔ ان سے سلام اور دعا کا رشتہ قائم کرو۔ اگر کہیں غریب لوگ نظر آئیں تو ان کی فطرہ، زکوٰۃ، صدقہ یا خیرات کی رقم سے اسی وقت یا کسی اور وقت مدد کرو تاکہ وہ بھی سماج میں عزت سے جی سکیں۔

عید گاہ جاتے وقت اور نماز پڑھ کر دوسرے راستے سے آتے وقت دھیمی آواز میں پورے راستے ہم والد صاحب کے

ساتھ ساتھ یہ تکبیر پڑھتے رہتے:

اللہ اکبر، اللہ اکبر، لا الٰہ الا اللہ، واللہ اکبر، اللہ اکبر، وللہ الحمد۔

نمازِ عید ادا کرنے کے بعد ہم خطبہ سنتے۔ خطبہ عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے میں اکتا جاتا اور جلد سے جلد عید گاہ میں لگا میلہ دیکھنا چاہتا لیکن والد صاحب تاکید کرتے کہ خطبہ سمجھ میں آئے نہ آئے، اس کا احترام کرنا لازم ہے کیونکہ خطبہ پڑھنا اور سننا سنتِ رسول ہے۔ خطبے کے بعد، امام صاحب ملک، سماج اور قوم کے لیے دعا کرتے اور ہم نمازی آمین کہتے۔ ختمِ دعا کے بعد، ہم وہاں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے ہوئے عید کی مبارک دیتے اور پھر گھر کے لیے رخ کرتے کیونکہ والد صاحب ہمیں میلہ دکھا کر جلد سے جلد سیدھے گھر آنا پسند کرتے۔

عید گاہ سے واپس آ کر گھر میں سب ایک دوسرے کو عید کی مبارک باد دیتے۔ بڑے اپنے سے چھوٹے اور بچوں کو عیدی دیتے۔ عیدی پانا ہم بچوں کے لیے سب سے بڑی خوشی کی بات ہوتی کیونکہ بچوں کے لیے عید کا دن پیسے جمع کرنے کی معصوم خوشی کا ایک خاص اور اہم دن ہوتا۔ اس موقع پر ہم سبھی بچے اپنی اپنی عیدی شمار کرتے اور ایک دوسرے پر برتری جتانے کی کوشش کرتے کہ انھیں عیدی زیادہ ملی ہے۔ ہم عیدی بہت سنبھال کر رکھتے۔ کسی کو بھی، یہاں تک کہ والدین کو بھی ہاتھ نہیں لگانے دیتے۔ اگر عیدی کھونے یا اس پر کسی کا قبضہ ہونے کا اندیشہ ہوتا تو مٹی کے خوبصورت گلک میں اسے جمع کرتے۔

عام طور سے چھوٹے اپنے بڑوں کے یہاں سہ پہر کے وقت یا دیر شام کو مہمانوں سے فراغت پا کر ان کے گھر جا کر عید کی مبارک باد پیش کرتے۔ اسی طرح بڑے بھی اپنی سہولت کے مطابق، اپنے چھوٹوں کے یہاں جا کر نیک خواہشات اور عید کی مبارکباد دیتے۔

یہ سلسلہ تین دن سے ایک ہفتے تک چلتا رہتا۔ اس پورے مہینے کوئی بھی مہمان گھر آتا تو اس کی خاطر تواضع میں دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ میٹھی سویّاں ضرور پیش کی جاتیں اور عیدی بھی ضرور دی جاتی۔

اتفاق سے اگر کوئی عیدی دینا بھول جاتا تو ہم بہت اپنائیت اور معصومیت سے عیدی، تحفے میں کوئی تکلف نہ کرتے۔

عید کی خوشی میں غیر مسلم بھی بڑے جوش و خروش سے شرکت کرتے۔ گھر آتے، گلے ملتے اور عید کی مبارکباد دیتے۔ ہمارے پڑوسی، والد صاحب کے دوست اور آفس کے لوگ، چچا طلسی جی، چچا شریواستو جی، چچا مشرا جی، چچا شرما جی، چچا ورما جی، چچا تیواری جی، چچا چترویدی جی، چچا مہتا جی، چچا بھٹ جی، چچا واسوانی جی، چچا سردار امر سنگھ، چچا اشوک جین جی، چچا ٹھاکر جی وغیرہ بھی ہمیں عیدی دیتے، گلے لگاتے اور آشیرواد دیتے۔

دوسرے یا تیسرے دن کئی لوگ عید ملن کا اہتمام کرتے جہاں والد صاحب ہمیں بڑے شوق سے لے جاتے۔ وہاں ہم سبھی لوگ اچھے اچھے نان ویج پکوان اور مٹھائی کھاتے۔ وہاں شعر و شاعری اور موسیقی کی محفل بھی سجتی جس کا سرور آج بھی میری یادوں میں محفوظ ہے۔ ان محبت بھری خوشگوار محفلوں کی خوشبو آج بھی میرے ذہن کو معطر کر دیتی ہے!

(تعارف جون 2021 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

■

Rais Siddiqui
Bungalow No.: 2, Rahat Kada
14- Green Valley Enclave, Airport Road
Bhopal - 462030 (Madhya Pradesh)
Mob.: 9810141528

کیا عیدیں تھیں اور کیا عیدی

رونق جمال

عید اور عیدی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عید آتی ہے تو عیدی بھی آتی ہے۔ عید کا مطلب ہے خوشی کے اور عیدی کا مطلب معنی ہے خوشی کی قیمت کے! جی ہاں آج کے اس ترقی پسند دور میں عیدی کے یہی معنی لیے اور سمجھے جاتے ہیں۔ گزرے زمانے میں عیدی کے معنی ہوا کرتے تھے بزرگی شفقت اور محبت کے۔ لیکن وقت کے ساتھ سب کچھ بدل چکا ہے تو معنی کا بدل جانا تو معمولی سی بات ہے۔ گزرے زمانے میں بچوں کو روزے نماز سے جوڑنے کے لیے عیدی کا رواج تھا۔ رمضان کا چاند ہوا نہیں کہ ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی بچوں کو دعوت دیا کرتے تھے کہ جو پورے روزے رکھے گا پوری نماز ادا کرے گا اسے عیدی دی جائے گی، جو وہ چاہے گا۔ جو آدھے روزے رکھے گا اور آدھی نماز ادا کرے گا اسے آدھی عیدی ملے گی اور جو صرف تین روزے رکھے گا اس کو یہ عیدی ملے گی وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال جتنی عمر کے بچے اتنی ہی عیدی کے زمرے! اور بچے عیدی کے لالچ میں زیادہ سے زیادہ روزے رکھنے اور نماز کی پابندی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس طرح سے بچوں میں روزہ رکھنے اور نماز پڑھنے کی عادت کو بیدار کیا جاتا تھا۔ بچے رمضان میں روزے رکھتے اور نماز کی پابندی کرتے تو خود بخود مذہب کے قریب ہو جاتے تھے۔ مذہب سے قریب ہو کر وہ دین کی باتیں شریعت اور اسلام کو بخوبی سمجھ لیتے تھے۔ جو باتیں اساتذہ مولوی برسوں میں نہیں سکھا پاتے تھے وہ بچے عیدی کے چکر میں صرف ایک مہینے میں سیکھ لیتے تھے۔ پھر دینی علم کچھ ایسا ہے کہ جس نے ایک بار یاد کیا عمر بھر کے لیے یاد ہو جاتا ہے۔ بس پھر کیا تھا عید ہوتی اور وعدے کے مطابق عیدی مل جاتی تو عید میں عید ہو جاتی۔ خاندان کے بزرگ عیدگاہ سے سجدۂ شکر ادا کر کے لوٹتے اور گھر بھر کے بچے انھیں عیدی کے لیے گھیر لیتے۔ بزرگ بھی بچوں کی عیدی عیدی کی رٹ کے درمیان اپنے آپ کو بادشاہ تصور کرتے اور بچوں کے شور و غل سے لطف اندوز ہوتے۔ وعدے کے مطابق سب کو عیدی تقسیم کرتے

خوش ہوتے اور عیدی کے ساتھ ساتھ شفقت، محبت، ڈھیر ساری دعائیں بھی دیتے۔ گزرے زمانے میں بچے پہلے عیدی حاصل کرنے کے لیے شور وغل مچاتے اور عیدی مل جانے کے بعد خوشی میں شور وغل مچا کر گھر کو سر پر اٹھا لیتے تھے۔ بچوں کی مستی میں گھر کے بڑے بزرگ بھی شامل ہو جایا کرتے تھے جس سے عیدی کا جشن اور بھی پر لطف و دلچسپ ہو جایا کرتا تھا۔ عیدی کے جشن کی وجہ سے عید کی خوشیوں میں چار چاند لگ جاتے تھے۔ عیدی جیسی بھی ہوتی جتنی بھی ہوتی وہ اپنی جگہ! لیکن عیدی بچوں کو تمیز، تہذیب، اخلاق و محبت بھی سکھاتی تھی۔ رشتوں میں مضبوطی اور خلوص کی چاشنی بھر دیتی تھی!

اب نہ وہ عیدیں نظر آتی ہیں اور نہ عیدی کا وہ جشن۔ بلکہ اس زمانے کے بچے تو عیدی کے سلسلے میں کچھ بھی نہیں جانتے! جو جانتے بھی ہیں وہ عیدی مانگنا تہذیب کے خلاف سمجھتے ہیں کیونکہ آج کی ترقی پسند مائیں انھیں پہلے ہی سکھا دیتی ہیں۔ دیکھو چنٹو منٹو اور پنچو تم کسی سے کوئی عیدی وغیرہ نہیں مانگنا۔ عیدی مانگنا بہت خراب لگتا ہے۔ یہ عیدی مانگنا بھکاریوں کا کام ہے سمجھے! میں نے تمھارے ڈیڈی سے کہہ دیا ہے وہ تمھیں فلم دیکھنے اور موج مستی کرنے کے لیے پاکٹ منی دگنی دینے والے ہیں! مام از گریٹ! ترقی پسند بچے بھی اپنی ماں کی بات کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ ماں باپ کی اسی سیکھ کی وجہ سے عیدی کا جشن ختم سا ہو کر رہ گیا ہے۔ ہم نے عیدی بٹنے کا لطف تو خوب اٹھایا ہے لیکن عیدی دینے کے مزے سے ہمارا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ عیدی ہم سے ضرور وصول کرتے ہیں لیکن روزے رکھ کر یا تراویح ادا کر کے نہیں بلکہ بڑا بیٹا ہر سال رمضان شریف کے آتے ہی راگ الاپنے لگتا ہے۔ "ڈیڈی... میری موٹر سائیکل کو پورا ایک سال ہو گیا ہے... پچھلے سال عید پہ بدلی تھی۔ اس سال پھر سے نئے ماڈل آ گئے ہیں۔ میرے سارے دوستوں نے اپنی اپنی موٹر سائیکل بدل لی ہے۔ کون سی بائک دلا رہے ہیں آپ اس بار مجھے!" اور ہم نہ چاہتے ہوئے بھی اسے نئی موٹر سائیکل دلانے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ نہ دلاؤ تو بیگم حمیدہ بیٹے کی طرف داری کے لیے کھڑی ہو جاتی ہیں!

موٹر سائیکل دلاؤ تو عید کے دن بیٹے کا دیدار مشکل ہوتا ہے کیونکہ وہ سارا دن دوستوں کے ساتھ سڑکیں ناپتا رہتا ہے! بیٹی ہے وہ کچھ سنجیدہ قسم کی ہے۔ ماں جو بھی دلا دیتی ہے خاموشی سے رکھ لیتی ہے۔ ماں بے چاری ابھی سے اس کی شادی کا خیال رکھ کر ہی کوئی زیور خرید کر دے دیتی ہے جو اس کے بیاہ کے وقت دینے کے کام آئے گا۔ اتنا بڑا گھر اور ہم چار نفوس عید کے دن عیدی کے جشن کے بغیر گھر سونا سونا سا لگتا ہے۔ نہ شور وغل نہ عیدی عیدی کے نعرے نہ دھما چوکڑی! وقت کے ساتھ ساتھ عید کا طریقہ بھی بدل گیا ہے جس میں عیدی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔

میرا دل اب بھی چاہتا ہے کوئی آئے اور عیدی مانگے اور عیدی کے لیے بضد ہو جائے۔ میں چند لمحے تامل کر کے اسے عیدی دے دوں اور وہ خوش ہو جائے... اور میرا گھر، گھر کے در و دیوار عیدی کے نعروں سے گونج اٹھیں تو میری بھی عید ہو جائے۔ عیدی!! میں اسی خیال سے عید کے دن اپنے بچپن کی عیدوں کو عیدی کے جشن کو یاد کر کے گزار دیتا ہوں۔ ہائے کیا دن تھے۔ کیا عیدیں تھیں اور کیا عیدی!!

■

Raunaq Jamal
'Kainat' Street No.: 9, New Adarsh Nagar
Drug- 491001 (Chhattisgarh)
Mob.: 9981072672

محمد سراج عظیم

ایڈوانس عیدی

"ننھو، او ننھو!" نافعہ کی ممی نے کمرے سے پکارا کوئی جواب نہ پاکر دوبارہ اس کی ممی نے تیز آواز میں چیختے ہوئے آواز دی "" اُفوہ ننھو ووہ! اچھا مت سن ابھی آتی ہوں..." نافعہ کی ممی نے کمرے میں بیٹھے بیٹھے غصے میں کہا اور کمرے سے جھنجھلا کر ہال میں آگئیں ڈائننگ ٹیبل پر نظر ڈالتے ہوئے بولیں "ارے ابھی تو یہیں تھی کہاں گئی"

انھوں نے گھبراتے ہوئے لہجے میں حیرت سے کہا اور باہر کے کمرے میں نافعہ کے پاپا کے پاس آکر بولیں "کیا نافعہ آپ کے پاس ہے" اس کے پاپا نے چونکتے ہوئے کہا "کیا؟ نافعہ یہاں کہاں ادھر ہی ہوگی۔"

"ادھر ہال میں تو نہیں ہے، کہاں ہے؟" اس کی ممی نے کہا۔ وہ پریشان ہوگئی تھیں۔

نافعہ دس سال کی تھی۔ چوتھی کلاس میں پڑھتی تھی۔ بہت ذہین اور چنچل بچی تھی۔ پچھلے ڈیڑھ مہینے سے کورونا وائرس کی وبا کی وجہ سے ملک میں لاک ڈاؤن تھا اور سارے لوگ گھروں میں بند تھے۔ نافعہ جس کو سب ننھو کہتے تھے وہ بھی گھر میں تھی اوروں کی طرح وہ بھی گھبرا گئی تھی۔ سارے گھر والوں سے طرح طرح کے سوال کرکے پریشان کرتی، چھوٹے بھائی سے ایک منٹ نہیں بنتی، جب بھی دونوں کھیلتے لڑائی ہوجاتی۔ کبھی ٹی وی پر کارٹون دیکھتی، تو کبھی موبائل پر گیم کھیلتی، جب بور ہو جاتی تو ماں سے باہر کالونی میں دوستوں کے پاس جانے کی ضد کرتی تو وہ بہلا پھسلا کر باہر جانے سے باز رکھتی۔ آج تھوڑی دیر پہلے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی موبائل میں کچھ دیکھ رہی تھی۔

ارے امی" کیا نافعہ آپ کے پاس ہے؟" اس کے پاپا نے نافعہ کی دادی سے پوچھا۔

"نہیں تو یہاں تو نہیں ہے" دادی نے باہر آتے ہوئے کہا۔

"ارے تو کہاں ہے؟ دیکھو باتھ روم میں تو نہیں ہے"

نافعہ کے پاپا نے بے چینی سے کہا۔

نافعہ کی ممی نے باتھ روم میں جھانک کر دیکھا "یہاں بھی نہیں ہے میرے اللہ کہاں ہے" وہ تقریباً رونے والے

انداز میں بولیں۔

"گھبراؤ مت کہیں نہیں گئی ہوگی، دیکھو بالکنی میں تو نہیں ہے۔" دادی بولیں۔

نافعہ کے پاپا تیزی سے فلیٹ کے صدر دروازے کی طرف لپکے، دیکھا تو لکڑی اور جالی کے دونوں دروازے کھلے تھے۔ دروازے کے باہر بالکنی اور نیچے جانے کے لیے زینے تھے۔ انھوں نے آواز لگائی "نفو، نفو بیٹا، کہاں؟" "کیا ہوا؟ ممی کیا نافعہ بالکنی پر؟" دادی اور ممی دونوں نے پاپا کے پیچھے آتے ہوئے ایک ساتھ پوچھا۔

"نہیں یہاں تو نہیں ہے، مگر دروازہ تو جب سے لاک ڈاؤن ہے، تب سے مستقل بند ہے۔ یہ دروازہ کھولا کس نے؟" پاپا پریشان ہوتے ہوئے بولے۔

"کیا پاپا!! یہاں بھی نہیں ہے!! کہاں گئی میری بچی اس لاک ڈاؤن میں؟" نافعہ کی ممی نے چیختے ہوئے کہا اور زور زور سے رونے لگیں۔

"اللہ خیر کرے، بچی جانے کہاں نکل گئی" دادی بھی تقریباً رو دینے کے سے انداز میں بولیں۔ "ارے بھیا نیچے جا کر کالونی میں چوکیدار سے پوچھو۔ بڑا غضب ہو گیا" دادی چیختے ہوئے پاپا سے کہہ رہی تھیں، وہ تیزی سے نیچے اتر گئے تھے۔

"ارے امی خدا نہ کرے کالونی میں نہیں ہوئی تو پھر اس لاک ڈاؤن میں کہاں تلاش کرتے پھریں گے" معراج چاچا نے غصے سے کہا۔

"نہیں بھیا!! اللہ نہ کرے۔ ایسے مت کہو" دادی بڑی لجائی آواز میں بولیں۔ نافعہ کی ممی یہ باتیں سن کر اور زور زور سے رونے لگیں۔ تبھی نافعہ کے پاپا گھبرائے ہوئے، گھر میں داخل ہوئے۔ سب نے ان کو دیکھ کر پوچھا۔ "کیا ہوا ملی؟" نافعہ کے پاپا نے سر جھکا لیا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے "انھیں پوری کالونی سونی پڑی ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ" ممی اور زور زور سے رونے لگیں۔

اتنی دیر میں، گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ نافعہ کی ممی مستقل روئے جا رہی تھیں۔ ادھر دادی نے فوراً اپنے سارے بیٹوں کو، دہلی، امریکہ، دبئی، جہاں سب جگہ نفو کے غائب ہونے کی خبر دے دی تھی۔ دادا گھر کے سارے لوگوں پر غصہ کر رہے تھے کہ سب کے سب بچی سے غافل ہو گئے، نافعہ

کی ننھیال میں بھی خبر ہوگئی تھی۔ سب کے فون آرہے تھے۔ ایک عجیب منظر تھا۔ ہر آدمی اپنی اپنی کہہ رہا تھا، ہر کوئی پریشان تھا۔ عجیب پریشانی کا عالم تھا۔ لاک ڈاؤن کی وجہ سے، نہ تو کوئی کہیں جا سکتا تھا، نہ آسکتا تھا۔ رضوان چچا گورنمنٹ آفیسر تھے۔ ان کے پاس منسٹری کا آئی کارڈ تھا، اس لیے وہ گھبرا کر موٹر سائیکل سے ذاکر باغ پہنچ گئے، انھوں نے آتے ہی غصہ میں پوچھا۔

"کیا ہوا بھابھی!!! آپ لوگوں نے لاپرواہی کی انتہا کر دی، کسی نے دیکھا ہی نہیں کہ دس سال کی بچی خاموشی سے کہاں چلی گئی؟"

"ارے بھئی ہر وقت سب گھر میں ہیں، ہر وقت باہر نہ جانے کی تاکید ہوتی رہتی ہے۔ اب یہ تھوڑی پتہ تھا کہ ایسی چھپیا ہوگی کہ خاموشی سے نکل جائے گی۔ ویسے یہیں کالونی میں کسی کے گھر پہ ہوگی" دادی نے کہا۔

گھر میں کہرام مچا ہوا تھا تبھی دروازے کی گھنٹی بجی۔ نافعہ کے پاپا فوراً دروازے کی طرف دوڑے۔ "کون ہے" کہتے ہوئے دروازہ کھولا، تبھی سامنے نافعہ نظر آگئی "ارے بیٹا تم کہاں گئی تھیں؟" نافعہ تیزی سے اندر چلی گئی، پیچھے مشرا چوکیدار کھڑا تھا۔ اس نے کہا "ارے صاحب بٹیا کالونی کے پیچھے والے گیٹ سے آرہی تھیں۔ ہم نے دیکھا تو ایک دم ان کی طرف لپکے۔ ان سے پوچھا کہاں گئی تھیں۔ بٹیا بولیں نوری آنٹی کے گھر، تو صاحب ہم ان کو لائے ہیں۔"

"اچھا مشرا جی شکریہ" نافعہ کے پاپا نے کہا اور اندر آگئے۔

اندر دادا دادی رضوان چاچا نافعہ کو ڈانٹ رہے تھے کہ کہاں گئی تھی اور نافعہ اپنی ممی کے دامن میں منہ چھپائے ہوئے سسک رہی تھی۔

پاپا نے نافعہ کو گود میں لیا۔ آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا "بیٹا تم کیا؟ نوری آنٹی کے یہاں گئی تھیں!!"

نافعہ نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

"کیوں بیٹا؟" پاپا نے پیار سے پوچھا۔

"ارے پاپا، آپ کے دوست وہ عدنان انکل کی بچپن گروپ پر ہم نے عیدی فلم دیکھی تھی۔ اس میں وہ کہہ رہے تھے۔ اس کورونا بیماری کی وجہ سے لاک ڈاؤن میں بہت سے غریب بھوکے مر رہے ہیں۔ ان کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے، تو اس بار اپنی عیدی، اپنے ابو سے ایڈوانس لے کر، کسی غریب کو دیجیے، تو اللہ آپ سے خوش ہوگا۔ تو پاپا ہم اپنے جوڑے ہوئے پیسے، نوری آنٹی کی بیٹی رضیہ کو دینے گئے تھے" نافعہ نے بہت معصومیت سے بتایا۔

"ارے بیٹا!! تو ہم سے کہتیں، ہم دیتے، تم بتا تو جاتے، اپنے آپ چلی گئیں، یہاں ممی کا روتے روتے برا حال ہو گیا۔ سارے لوگ یہاں سے لے کر امریکہ تک پریشان ہو گئے۔"

"ارے پاپا تو ہمیں کیا معلوم؟ ہم تو رضیہ کو ایڈوانس عیدی دینے گئے تھے۔" نافعہ نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا، ان کے چھوٹے بھائی جواد ان سب کی باتیں سن رہے تھے اور نافعہ پر دانت چبا چبا کر غصہ کر رہے تھے بولے "آپی تم کیا بے وقوف ہو!! عیدی!! تو بڑے لوگ دادا دادی دیتے ہیں، کوئی چھوٹے تھوڑی دیتے ہیں۔ تم کیا بڑی دادی ہو" اور ان کی اس بات سے پورا گھر ہنسنے لگا—

(تعارف اگست 2021 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

■

Mohammad Siraj Azeem
A-47, Zakir Bagh
Opp. Surya Hotel, Okhla Road
New Delhi - 110025

مدثر کی عید

شاداب ابراہیم

عید کی صبح گاؤں میں ہر طرف چہل پہل تھی، بچے تو کئی دن سے عید کی تیاری میں لگے ہوئے تھے، نئے کپڑے خریدے گئے، گھروں کی صفائی ہوئی، راستے کی گندگی ہٹائی گئی، عید گاہ کی طرف جانے والی سڑک کو سجایا گیا، مدثر نہا دھو کر تیار ہو گیا، والدہ نے نئے کپڑے پہنا دیے، مدثر کے لیے دادا اور والد ایک ایک کپڑا لائے تھے، نئے کپڑے پہن کر اس نے دادا دادی، والد والدہ اور پھوپھی کو سلام کیا، سبھی نے مدثر کو عیدی دی، اب وہ چھ سو روپے کا مالک تھا، پیسوں کو کبھی اس جیب میں رکھتا تو کبھی اس جیب میں، دادی نے کہا: بیٹا! پیسوں کو سنبھال کر رکھنا، راستے میں کہیں گرا مت دینا۔

دادا اور والد کے ساتھ مدثر عید گاہ کی طرف نکلا، عید گاہ کی طرف جانے والی سڑک پر لوگوں کا ہجوم تھا، مدثر بھی والد اور دادا کی انگلی پکڑ کر عید گاہ کی طرف بڑھتا جا رہا تھا، عید گاہ پہنچتے ہی اس کی ملاقات دیپک سے ہو گئی، والد اور دادا کا اس نے ساتھ چھوڑ دیا، دیپک کے ساتھ جانے لگا، دادا نے روکتے ہوئے کہا: کہاں جا رہے ہو ابھی عید کی نماز ہونی، نماز بھی پڑھنی ہے۔

ہم دیپک کے ساتھ نماز پڑھ لیں گے کہہ کر مدثر دیپک کے ساتھ بھیڑ میں دادا کی نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔

مدثر کی نگاہ بھیڑ بھاڑ میں جس کو ڈھونڈ رہی تھی وہ عاقب تھا وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا، عید گاہ کے چاروں طرف مدثر اور دیپک نے عاقب کو ڈھونڈا، لیکن وہ تب بھی نہیں مل سکا۔ مدثر، دیپک اور عاقب گاؤں میں ماسٹر گیان جی کے مکتب میں ساتھ ہی پڑھتے تھے، تینوں میں گہری دوستی تھی، پڑھائی سے زیادہ وقت بات چیت میں ہی گزرتا تھا، چھٹی کے بعد بھی اکثر تینوں ایک ساتھ نظر آیا کرتے تھے، مدثر اور دیپک بسکٹ، چاکلیٹ خریدتے تو عاقب کے لیے بھی خریدتے پھر تینوں ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے اور گھنٹوں فضول کی گفتگو کرتے۔

عاقب کی والدہ مدثر کے گھر میں برتن اور کپڑے دھلنے کا کام کرتی تھی جس کا علم نہ تو مدثر کو تھا اور نا ہی عاقب کو۔ اس کے علاوہ وہ بھی کئی گھروں میں صاف صفائی اور کھانا پکانے کا کام کرتی تھی، وہ بیوہ تھی، عاقب کے علاوہ ایک لڑکی اور بھی تھی، دونوں بچوں کی پرورش وہ کسی طرح سے کر رہی تھی، اس کا شوہر ایک سڑک حادثے میں عاقب کی پیدائش کے دن، نو سال پہلے انتقال کر گیا تھا، دیپک اور مدثر نے عید گاہ پر عاقب کو ڈھونڈنے

کی ہر طرح سے کوشش کی مگر عاقب کہیں نہیں ملا تو دیپک نے کہا:

لگتا ہے عاقب نہیں آیا ہے، اگر آتا تو کہیں نہ کہیں مل جاتا ایسا کرتے ہیں ہم اس کے گھر چل کر دیکھتے ہیں، کیا بات ہے؟ کیوں نہیں آیا؟

ہاں... ہاں... چلنا تو چاہیے لیکن مجھے تو اس کا گھر پتا ہی نہیں ہے، کیا تم نے اس کا گھر دیکھا ہے، کس محلے میں اس کا گھر ہے!

مدثر نے دیپک سے پوچھا۔

پڑوس کے محلے میں اس کا گھر ہے، دیوالی کی مٹھائی پہنچانے پچھلے مہینے اس کے گھر گیا تھا، وہ اپنی والدہ اور اپنی بہن کے ساتھ رہتا ہے۔

اور اس کے والد کہاں رہتے ہیں؟

مدثر بیچ میں بول پڑا اس کے والد تو پہلے ہی انتقال کر چکے ہیں، صرف والدہ اور بہن ہے۔

دیپک نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

بات کرتے کرتے دونوں عاقب کے گھر تک پہنچ چکے تھے، اندر داخل ہوتے ہی عاقب کو ڈھونڈنے لگے مگر عاقب پر نظر نہیں پڑی، اس کی بہن پر نظر پڑی تو دونوں نے عاقب کے سلسلے میں پوچھا جب تک عاقب کی والدہ آگئی اور کہا کہ عاقب گھر پر ہی ہے۔

گھر پر کیوں ہے وہ عیدگاہ کیوں نہیں گیا، آج تو عید کا دن ہے، ہم سب نے نئے کپڑے پہنے ہیں اسے بھی نیا کپڑا پہن کر عیدگاہ آنا چاہیے تھا، ہم نے اسے عیدگاہ میں ہر جگہ ڈھونڈا لیکن وہ کہیں نہیں ملا، وہ ہمیں ملتا کیسے وہ تو گھر پر تھا اسے آپ نیا کپڑا پہنا دیجیے، وہ ہمارے ساتھ جائے گا، ہم دیپک اور عاقب ساتھ میں نماز پڑھیں گے، میرے لیے تو والد اور دادا دونوں لوگ نئے کپڑے لائے ہیں، ابھی تو دادا والا کپڑا پہن کر آیا ہوں واپس جا کر والد والا کپڑا پہن لوں گا، عیدی تو پھوپھی اور دادی نے بھی دی ہے، آپ بھی عاقب کو نیا کپڑا پہنا دیجیے اور عیدی دے دیجیے پھر ہم تینوں ساتھ جائیں گے۔

عاقب کی والدہ کی آنکھیں مدثر کی باتوں سے ڈبڈبا گئیں اور آنسو کا ایک قطرہ دیپک کے پاؤں کی انگلی پر گر پڑا تو اسے عاقب کی والدہ کے رونے کا احساس ہوا اور اس کی نگاہیں عاقب کی والدہ کے چہرے پر جا کر ٹک گئیں، مدثر بولتا جا رہا تھا اسے بھنک تک نہیں لگی جب دیپک نے کہا، آپ کی آنکھوں میں یہ آنسو کیوں ہیں، آج تو خوشی کا دن ہے ہر شخص خوشی منا رہا ہے سب کے چہرے پر مسکراہٹ ہے، عاقب کی والدہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا: نہیں...... کوئی بات نہیں ہے، آنسو کہاں ہے... میں تو خوش ہوں، کچھ نہ کچھ بات تو ضرور ہے جسے آپ ہم سے چھپا رہی ہیں، عاقب کی والدہ کی مصنوعی مسکراہٹ کو دیکھتے ہوئے دیپک نے کہا۔

ہاں... چچی جان... آپ تو ہم لوگوں سے کچھ چھپا رہی ہیں، آپ بتائیں تو سہی: بات کیا ہے، دیپک نے عاقب کی والدہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا، بیٹا... عاقب اس لیے عیدگاہ نہیں گیا کہ اس کے پاس نیا کپڑا نہیں ہے، میرے پاس کپڑے خریدنے کے لیے پیسے بھی نہیں ہیں، گذشتہ سال تو ایک صاحب نے نیا کپڑا دے دیا تھا مگر اس مرتبہ کہیں سے بھی نئے کپڑے کا انتظام نہیں ہو سکا۔ دیپک کی ضد کو دیکھتے ہوئے عاقب کی والدہ نے کہا

نئے کپڑے نہ ہونے کی وجہ سے عاقب عیدگاہ نہیں گیا ہے۔ تب تو آپ کے پاس عیدی دینے کے لیے بھی پیسے نہیں ہوں گے، مدثر بیچ میں بول پڑا۔

دیپک نے مدثر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: تم پانچ منٹ رکو، میں آتا ہوں، پھر ہم ساتھ چلیں گے۔

چچی جان... میں ابھی آتا ہوں... عاقب کی والدہ کو دیکھتے ہوئے دیپک نے کہا اور گھر سے نکل گیا۔ عاقب کے گھر سے نکل کر دیپک اپنے گھر گیا اور والدہ سے کہا کہ دیوالی کا میرا ایک نیا کپڑا جسے ہم نے نہیں پہنا تھا اسے نکال دیجیے، بے موقع نئے کپڑے کے لیے کہنے کی وجہ سے والدہ کو بڑا تعجب ہوا مگر والدہ نے پیٹی سے نیا کپڑا نکال کر دے دیا، جسے لے کر دیپک گھر سے نکلنے لگا تو والدہ نے کہا:

پکن لو! لے کر کہاں جا رہے ہو، نہیں... نہیں... پہننا نہیں ہے... کہتے ہوئے دیپک گھر سے نکل گیا، دیپک اپنا دیوالی والا نیا کپڑا لے کر عاقب کے گھر پہنچا، مدثر اور عاقب کی والدہ کے سامنے اسے تھیلے سے نکالا، پھر مدثر اور دیپک نے مل کر اسے پہنایا جسے دیکھ کر عاقب کی والدہ کے چہرے پر مسکراہٹ کے آثار ظاہر ہونے لگے، دیپک نے عاقب کی والدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، یہ میری طرف سے عاقب کی عیدی ہے۔ بیچ میں مدثر بول پڑا۔

چلو اب ہم چلتے ہیں عیدگاہ پہنچ کر ہمیں نماز بھی پڑھنی ہے۔

ہاں... ہاں... چلو اب ہم چلتے ہیں، وقت بھی زیادہ ہو گیا ہے، دیپک نے باہر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

دیپک اور عاقب گیٹ کی طرف بڑھے مگر مدثر چند قدم پیچھے تھا، اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور عاقب کی والدہ کو کچھ دیتے ہوئے کہا، یہ میری طرف سے عیدی ہے اور دوڑ کر دیپک اور عاقب کے پاس جا پہنچا، پھر تینوں خوشی خوشی عیدگاہ کی طرف جانے لگے۔ کچھ دیر کے بعد مدثر کے والد عاقب کے گھر پہنچے، عاقب کی والدہ کو بلانے کے لیے، عید کی وجہ سے مہمان زیادہ آ گئے تھے جس کی وجہ سے سارے برتن گندے ہو گئے تھے۔ عاقب کی والدہ متعینہ وقت پر تو روزانہ پہنچ ہی جاتی تھیں مگر آج مدثر کے والد پہلے ہی بلانے کے لیے پہنچ گئے اور عاقب کی والدہ سے گھر جا کر برتن صاف کرنے کے لیے کہا۔

عاقب کی والدہ نے کہا: بچوں کے لیے کھانا پکا رہی ہوں اس کے بعد جا کر برتن صاف کر دوں گی۔

صبح سے کھانا کیوں نہیں پکایا؟ مدثر کے والد نے کہا۔

گھر میں راشن نہیں تھا ابھی کچھ دیر پہلے دو بچے آئے تھے ایک نے میرے بیٹے کو نیا کپڑا دیا اور دوسرے نے پانچ سو روپے دیے تب راشن خرید کر لائی ہوں اور کھانا بنا رہی ہوں، مدثر کے والد کو جواب دیتے ہوئے عاقب کی والدہ نے کہا۔

ٹھیک ہے، کھانا پکانے کے بعد جا کر برتن صاف کر دینا، پچاس روپے کا نوٹ عاقب کی والدہ کو دیتے ہوئے کہا اور بازار کی طرف چلے گئے، سورج غروب ہونے ہی والا تھا، کچھ ضروری سامان بھی لینا تھا۔

مدثر، دیپک اور عاقب جب عیدگاہ پہنچے تو نماز تو ہو گئی تھی ساتھ ہی عیدگاہ سے بھیڑ بھی چھٹ چکی تھی صرف چند حلوائی مٹھائی کی دکان لگائے بیٹھے تھے، کھلونے والے کھلونے

ناچ رہے تھے، غبارے والے غبارے اچھال رہے تھے، دیپک نے کہا: یار بھوک لگ رہی ہے، صبح ناشتے کے بعد سے کچھ کھایا نہیں ہے۔

چلو ہم لوگ پہلے مٹھائیاں کھا لیتے ہیں، مدثر نے دیپک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تینوں حلوائی کی دکان پر پہنچے اور مختلف قسم کی مٹھائیاں دینے کے لیے کہا، جلیبی، امرتی، لڈو، سموسا، گلاب جامن، رس گلا، جی بھر کر تینوں نے کھایا، مدثر نے بچے ہوئے سو روپے میں سے ستر روپے نکال کر حلوائی کو دیے اور پھر تینوں کھیلنے لگے، خوب مستیاں کی، اچھل کود، دوڑ بھاگ، نئے کپڑے شام تک پرانے ہو گئے، سورج ڈوب چکا تھا، اندھیرا چھانے لگا تھا، دیپک نے کہا: اب ہمیں گھر چلنا چاہیے۔ ہاں... اندھیرا چھانے لگا ہے، شعیب نے ہاں میں ہاں ملائی۔

چلو ہم غبارہ خرید لیتے ہیں، پھر گھر چلتے ہیں، مدثر نے کہا۔

تینوں غبارے والے کے پاس پہنچ گئے، ایک ایک غبارہ لیا، مدثر نے بچے ہوئے تیس روپے نکال کر غبارے والے کو دیے، تینوں ایک دوسرے کو الوداع کہتے ہوئے اپنے اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔

مدثر گھر پہنچا، ہاتھ میں غبارہ تھا، دادی کی نظر سب سے پہلے پڑی، دادی نے ڈانٹتے ہوئے کہا: تم کہاں تھے، دن بھر کچھ کھایا نہیں ہے، اب شام ہوئی ہے تب آئے ہو۔

دادی کی آواز سن کر والدہ بھی آگئیں اور مدثر کو ڈانٹنے لگیں: دن بھر کچھ کھایا نہیں ہے، کپڑا دیکھو کتنا میلا کر لیا ہے، شرٹ کا بٹن کھولتے ہوئے والدہ نے کہا، پھر شرٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا، اس میں کچھ نہیں تھا تو مدثر سے کہا پیسے تم نے کیا کیے؟ چھ سو روپے تمہارے پاس تھے، مدثر نے پہلے تو کوئی جواب نہیں دیا پھر کہا: مٹھائیاں خریدی تھیں اور غبارے بھی،

چھ سو روپے کی مٹھائی تم نے کھائی اور غبارہ تو دس روپیہ کا ہے، والدہ نے چیختے ہوئے کہا، مدثر کچھ جواب نہیں دے پا رہا تھا، بار بار پوچھنے کے بعد بھی جب مدثر نے جواب نہیں دیا تو والدہ نے ایک تھپڑ رسید کر دیا، مدثر رونے لگا تو والدہ نے ایک تھپڑ اور رسید کر دیا، مدثر اور تیز رونے لگا، اسی درمیان والد صاحب بھی بازار سے واپس آ گئے اور مدثر کو روتا دیکھ کر کچھ سمجھ نہیں پائے، مدثر سے رونے کا سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ والدہ نے مارا ہے، جب والدہ سے مارنے کا سبب پوچھا تو والدہ نے کہا کہ چھ سو روپے اس کے پاس تھے، پتا نہیں ان پیسوں کا کیا کیا؟ کہہ رہا ہے کہ مٹھائی لی تھی: چھ سو روپے کی مٹھائی اس نے کیسے کھائی، والد نے مدثر کی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: بیٹا... تم نے چھ سو روپے کیا کیے؟ سچ سچ بتا دو، تمہیں کل بازار سے پھر مٹھائی لا کر دوں گا۔

مٹھائی کا نام سن کر مدثر نے بڑی معصومیت سے کہا: اپنے دوست عاقب کی والدہ کو عیدی دے دی تھی، ان کے پاس پیسے نہیں تھے اور نہ ہی نیا کپڑا تھا، اس لیے دیپک نے نئے کپڑے دیے اور میں نے پیسے دے دیے۔

مدثر کی بات سن کر والدہ کا غصہ اور بڑھ گیا اور بول پڑیں: یہ جھوٹ بول رہا ہے، مگر والد صاحب نے جب کپڑے کے سلسلے میں سنا تو ان کے کانوں میں عمر کی خودداری کی آواز گونج گئی، اور وہ پوری بات سمجھ گئے، آنکھیں بھر آئیں اور مدثر کو سینے سے لگا لیا۔

■

Shadab Ibrahim
At & Po Baurám, via Biraul
PS Jamalpur,
District: Darbhanga 847203 (Bihar)
Mob.: 9304786189

عید پر اشعار

شاعری میں بڑی طاقت ہے۔ اس سے تحریر و تقریر میں تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ مطلب میں زور اور تحریر میں قوت پیدا کرنے کے لیے اشعار کا استعمال بہت کارگر ہوتا ہے۔ پرانے زمانے کے لوگوں کو استاد شعرا کے ہزاروں اشعار یاد ہوا کرتے تھے اور وہ موقع کی مناسبت سے ان اشعار کا استعمال بھی کیا کرتے تھے۔

"چمن چمن کے پھول" میں مختلف رنگ اور شاعروں کے شعر اس لیے دیے جاتے ہیں تاکہ بچے موضوع کی مناسبت سے اچھے اشعار یاد کریں اور اپنی تحریر و تقریر میں اشعار کا موزوں اور برمحل استعمال کر سکیں۔ (ادارہ)

چلو ہم عید منائیں کہ جشن کا دن ہے
خوشی کے گیت سنائیں کہ جشن کا دن ہے

شفق کاکوی

دور ویران بسیرے میں دیا ہو جیسے
غم کی دیوار سے دیکھا تو لگا عید کا چاند

ساغر صدیقی

جہاں نہ اپنے عزیزوں کی دید ہوتی ہے
زمینِ ہجر پہ بھی کوئی عید ہوتی ہے

نعیم نازش

مہک اٹھی ہے فضا پیرہن کی خوشبو سے
چمن دلوں کا کھلانے کو عید آئی ہے

—محمد اسد اللہ

جو لوگ گزرتے ہیں مسلسل رہِ دل سے
دن عید کا ان کو ہو مبارک تہِ دل سے

—عبید اعظم اعظمی

چھیڑا ہے ایک نغمۂ شیریں بھی کو بہ کو
دل نے ہلالِ عید کی تمہید کے لیے

—افروز رضوی

ایسا ہو سب انسان ہوں خوش اتنے کہ ہر روز
اک دوسرے سے کہتا پھرے عید مبارک

ادریس بابر

جس روز کہ پہنچے ہے کسی کو کوئی مصیبت
اس روز ترا خوگرِ غم عید کرے ہے

نواب افتخار سجاد

احباب پوچھتے ہیں بڑی سادگی کے ساتھ
میں اب کے سال عید مناؤں گا کس طرح

نامعلوم

عید کی سچی خوشی تو دوستوں کی دید ہے
جو وطن سے دور ہے کیا خاک اس کی عید ہے

—نامعلوم

دعا ہے آپ دیکھیں زندگی میں بے شمار عیدیں
خوشی سے رقص کرتی، مسکراتی، پر بہار عیدیں

—نامعلوم

اب مزا آئے گا سب کو عید کا
بچہ بچہ منتظر ہے دید کا

—نامعلوم

کامیابی کی بلندی پر پہنچنے کا کوئی شارٹ کٹ نہیں، اس کے لیے محنت کرنی ہوگی: رفیع انصاری

س: بچپن کی کون سی باتیں، شوخیاں، شرارتیں اب بھی آپ کو بہت یاد آتی ہیں؟

ج: بچپن کے دوست، دشمن، بوڑھے بزرگ، راستے، گلیاں، عورتیں یادداشت میں محفوظ رہتی ہیں۔ میرے بچپن کا ایک دوست جس نے مجھے اسکول سے بھاگنے کی عادت سے آشنا کیا تھا۔ اسکول سے بھاگنے کی ایک سے زائد بار میری یہ چوری پکڑی بھی گئی۔ چونکہ بچپن ہی سے بڑا احساس واقع ہوا تھا، کچھ بڑے بوڑھوں کی باتوں سے متاثر ہو کر اور کچھ اپنے دل پر جبر کر کے کسی طرح اسکول جانے لگا۔

رفیع انصاری

س: بچپن میں آپ کے پسندیدہ مصنفین کون تھے اور اب کون ہیں؟

ج: بچپن میں مجھے نثر نگاروں سے زیادہ شاعروں نے متاثر کیا۔ رب کا شکر ادا کر بھائی رحمن نے ہماری گوے بنائی... سب پہ آئی ہے دعا بن کے تمنا میری... تم ندی پر جا کر دیکھو، جب ندی میں تیرنے چوند اسماعیل میرٹھی، اقبال اور حامد اللہ افسر کی دلکش نظمیں جو ہمارے نصاب کا ناقابل فراموش حصہ تھیں۔ منشی پریم چند کی کہانی 'عید گاہ' دان کے نام کی طرح دل پر آج تک نقش ہے۔ کرشن چندر کے بچوں کے لیے لکھے گئے ناول 'الٹا درخت' کی سیدھی سچی باتیں نہیں بھولتیں۔ سر سید احمد خاں کا سیدھا سادہ اسلوب دل میں اتر جاتا تھا، غالب کے خطوط کی سادہ بیانی اور رشید احمد صدیقی کی دلچسپ تحریروں نے مجھے اپنا عاشق بنا لیا۔ یہ وہ نازاہل قلم کل بھی ہمارے ہیرو تھے اور آج بھی ہیں۔ اس فہرست میں وقت اور عمر کے ساتھ اضافہ بھی ہوتا رہا۔

س: بچپن میں کس کتاب نے آپ کو بہت زیادہ متاثر کیا؟

ج: مجھے مدرسہ فوقانیہ کی اردو زبان دانی کی بھی درسی کتابوں نے بہت متاثر کیا۔ نویں جماعت کے نصاب میں اضافی مطالعہ کے طور پر رشید احمد صدیقی کی کتاب 'آشفتہ بیانی میری' کو بھی داخل کیا گیا تھا۔ اس کتاب نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ وہ بھی میری پسندیدہ کتاب ٹھہری۔ اسی طرح آل احمد سرور کی ایک تصنیف 'نئے اور پرانے چراغ' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مضامین کا مجموعہ طالب علموں کے لیے بے حد معلومات افزا اور مفید ہے۔

س: بچپن میں بچوں کے کون سے رسائل آپ پڑھتے تھیں؟

ج: بچپن میں 'غنچہ' نام کا بچوں کا ایک اخبار جو بجنور سے شائع ہوتا تھا بہت مقبول تھا۔ اس میں نہ کوئی تصویر ہوتی نہ کوئی کوڑولی کہانی۔ مگر یہ اخبار گھروں میں گلاب کی طرح مہکتا تھا۔ 'کھلونا' (نئی دہلی) جو 8 سے 80 سال کے بچوں کی اولین پسند تھا مجھے بھی بہت بھاتا تھا۔ رامپور سے شائع ہونے والا رسالہ 'نور' اور مکتبہ جامعہ کا میگزین 'پیام تعلیم' اسکول لائبریری میں جب بھی مطالعہ کی میز پر رکھا جاتا، لوٹ مچ جاتی۔ یہ تینوں رسالے مجھے بہت پسند آتے تھے۔

س: بچوں کے ذہنی اور فکری ارتقا کے لیے کون سی کتابیں زیادہ مفید ہیں؟

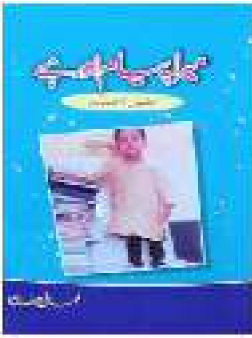

ج: اس میں کوئی شک نہیں کہ بچوں کے ذہنی و فکری ارتقا کے لیے نصابی کتابوں سے بڑھ کر کوئی لٹریچر نہیں۔ اس کی معقول وجوہات ہیں۔ ان اشاعتی اداروں کی لسانی کمیٹی ایسے ماہرین پر مشتمل ہوتی ہے جن میں بیشتر وہ اساتذہ ہوتے ہیں جو علم و فضل میں یکتائے روزگار کہلاتے ہیں۔ یہ مواد کے انتخاب میں ان رہنما اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہیں جو متداول ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں ادب اطفال کے لیے کام کرنے والے ادارے اور اصحاب جو کچھ تخلیق کرتے ہیں وہ اس باب میں کارآمد ہوتا ہے۔

س: زبان و بیان کو بہتر بنانے کے لیے کن مصنفین کی کتابیں بچوں کے لیے رہنما ثابت ہو سکتی ہیں؟

ج: یوں تو اس فہرست میں نئے پرانے بہت سے نام آ سکتے ہیں لیکن بنیادی طور پر سرسید احمد خاں، مولانا الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا شبلی نعمانی اور محمد حسین آزاد کے نام قابل ذکر ہیں۔ یقیناً زبان و بیان کو بہتر بنانے کے لیے ان مصنفین کی کتابیں اور ان کی نثری و شعری تخلیقات (بالخصوص جو انھوں نے ادب اطفال کے لیے تحریر کی ہیں) بچوں کے لیے رہنما ثابت ہو سکتی ہیں۔ اردو کے ان عناصر خمسہ کے بعد اس فہرست میں نئے اور پرانے کئی نام آتے ہیں۔

س: مستقبل اور اپنے کیریئر کو سنوارنے کے لیے بچوں کو کن موضوعات اور کتابوں کا مطالعہ کرنا سود مند ثابت ہوگا؟

ج: بچوں کو سائنس، ٹیکنالوجی اور نئے موضوعات کا مطالعہ اور مشق ضروری ہے۔ ان موضوعات کی تیاری کے لیے اب تعلیم گاہوں کے علاوہ فلاحی اور رفاہی ادارے بھی سرگرم ہیں۔ روزناموں اور ہفت روزہ اخباروں میں صفحات بھی مخصوص ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعے کریئر کونسلر طلبا کی رہنمائی کرتے ہوئے انھیں مفید مشوروں سے نوازتے ہیں۔ وہ طلبا کے ذریعے پوچھے گئے سوالوں کے جواب بھی دیتے ہیں۔ ادب اطفال کے فروغ کے لیے معروف اصحاب اور انجمنیں بھی اس باب میں معاون ثابت ہو رہی ہیں۔

س: اپنے سماجی اور تعلیمی کوائف کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج: میری پیدائش یکم جون 1951 میں بھیونڈی (مہاراشٹر) کے ایک متوسط خاندان میں ہوئی۔ سات بہن بھائیوں میں میرا نمبر دوسرا اگر بیٹوں میں پہلا تھا۔ میرے والد جن کا نام عبدالخالق تھا وہ شاعری کرتے تھے اور ان کا تخلص غیرت تھا۔ میرے دادا کا نام نور محمد تھا۔ وہ اپنے زمانے کے ماہر طبیب تھے۔ دادا بڑے پریکٹیکل آدمی تھے۔ محلہ، حول میں پرائمری کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں نے شہر کے نامی گرامی اردو میڈیم اسکول رئیس ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ اچھے ادارے، اچھے اساتذہ اور اچھے ماحول کے سبب میرے اندر چھپی صلاحیتوں کو جلا ملی۔ میں نے ہمت کر کے تحریری اور تقریری مقابلوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ میرے ایک استاد جناب عبدالمجید ربانی نے میرے اندر کے چھپے مقرر کو باہر نکالا۔ میرے ہیڈ ماسٹر جناب ظفر الاسلام مظفر نے حوصلہ بڑھایا۔ اسکول کے آخری سال میں مجھے کل مہاراشٹر انٹر سکنڈری اسکول اردو تقریری مقابلے میں پہلا انعام ملا۔ 1968 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور شہر کے اولین ڈگری کالج بی این این کالج (بھیونڈی

نظام پور نگر پالیکا کالج) میں داخلہ لیا۔ اس کالج کا الحاق ابتدا میں پونے یونیورسٹی سے تھا بعد میں ممبئی یونیورسٹی سے ہوا۔ 1972 میں میں نے اسی کالج سے بی اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ میں اپنے کالج کی اردو انجمن 'بزمِ ادب' کا سکریٹری بھی تھا۔ میں نے پہلے بی ایڈ اور پھر ممبئی یونیورسٹی ہی سے ایم اے کا امتحان پاس کیا۔

س: آپ کو بچوں کے لیے لکھنے کا خیال کب اور کیسے آیا؟

ج: بچوں کے لیے لکھنے کا خیال تو مدرسی کی ابتدا ہی میں پیدا ہو گیا تھا۔ ہمارے تعلیمی ادارے میں سالانہ تقریبات کا اہتمام خصوصی طور پر کیا جاتا تھا۔ بچوں اور بڑوں کو ان تقریبات کا انتظار بھی رہتا تھا۔ ان کی تیاری بھی ہفتوں کی جاتی۔ ان تقریبات میں ڈرامے، موڈو ایکٹنگ، طنزیہ و مزاحیہ فیچر، قوالی، کورس سانگ، وطنی نغمے وغیرہ شامل ہوتے تھے۔ چونکہ پرانی چیزیں (نغمے، وطنی گیت وغیرہ) سامعین زیادہ پسند نہیں کرتے تھے اساتذہ اور انتظامیہ کے اراکین بھی نئے آئٹم پیش کرنے پر زور دیتے تھے۔ ایسے ماحول نے کچھ کر دکھانے کا موقع فراہم کر دیا۔ چنانچہ آس پاس کے فنکاروں کی خدمات حاصل کرنے کے ساتھ میں نے اپنی تخلیقات پر توجہ دینی شروع کی۔ اس طرح بچوں کے لیے گیت، نظمیں، ڈرامے وغیرہ لکھنے کے خیال نے عملی شکل اختیار کر لی۔

س: آپ کی پہلی تخلیق کب اور کس رسالے میں شائع ہوئی؟

ج: مجھے وہ دن یاد ہے جب میں نے اپنا پہلا باقاعدہ افسانہ رسالہ بیسویں صدی (دہلی) کو بغیر کسی کو مطلع کیے اور دعا کے بذریعہ ڈاک بھیج دیا تھا۔ کچھ دنوں بعد جوابی ڈاک سے افسانے کی اشاعت کی منظوری کا کارڈ (جو ویڈنگ کارڈ سے مشابہ تھا) دستیاب ہوا۔ اس کارڈ کے ملنے کی خوشی مجھے ابھی تک محسوس ہوتی ہے۔ یہ افسانہ آج سے نصف صدی پیشتر مئی 1970 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد میں نے طنز و مزاح کے ساتھ بچوں کی نظمیں لکھنی شروع کیں۔ میرے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کے تین مجموعے اور بچوں کی نظموں کے بھی تین مجموعے 'زمین کے تارے'، 'جگ مگ جیو' اور 'میرا پیام' اور بے شائع ہو کر مقبول ہوئے۔

س: آپ کے مرکزی موضوعات کیا ہیں؟

ج: انسان کی عظمت کا بیان، احترام آدمیت، قومی یکجہتی، تعلیم کی افادیت اور پیامِ امن، میری نظموں کے مرکزی موضوعات بھی رہے ہیں۔

س: کتاب لکھنے سے پہلے آپ بچوں کے نفسیاتی اور ذہنی مطالبات پر ریسرچ کرتے ہیں یا نہیں؟

ج: چونکہ میں درس و تدریس سے وابستہ رہا ہوں۔ بچوں کے درمیان رہتے تھے ان کی پسند، ناپسند، خوشی، ناخوشی، محبت، نفرت، ذوق و شوق وغیرہ سے واقفیت ہوتی رہی ہے۔ گھر کے بچے اور بچوں کے بچے مجھے اس لیے پسند کرتے ہیں کہ میں انھیں ستاتا کم ہوں، ان کی سنتا زیادہ ہوں۔ وہ مجھے اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ وہ مجھ سے اپنی پریشانی بھی بتاتے ہیں اور شادمانی کے اسباب کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ بس یہیں سے مجھے لکھنے کی تحریک ملتی رہتی ہے۔

س: بچوں کے لیے لکھتے ہوئے آپ کو کس طرح کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

ج: اول تو بچہ بننا پڑتا ہے، جو آسان نہیں ہوتا۔ پھر اپنے متن میں ان کے لفظوں کو ڈال کر اپنی زبان کی آمیزش جیسے مشکل مرحلے کو طے کرنا پڑتا ہے۔ بچوں کے لیے لکھتے وقت لفظوں کا انتخاب بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ خیال ایسا ہو جو پیچ ہوتے ہوئے بھی آسان لگے۔ نظم کی صورت ہو تو رواں دواں بحر ہو۔ نثر کے جملے بہت طویل نہ ہوں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں کو سادگی سے برتا جائے۔ موضوع قریب کے ہوں۔ بچوں کی دلچسپی کے ہوں۔ ان دقتوں پر قابو پا کر بچوں کی تخلیق سے انصاف کیا جا سکتا ہے۔

س: ادیب اطفال کی حیثیت سے ادبی اور علمی حلقے میں آپ کی قدر دانی ہے یا نہیں؟

ج: بے شک شہر و بیرون شہر کے بیت بازی مقابلہ نظم خوانی، تمثیلی مشاعروں، تقریری و تحریری مقابلوں میں خصوصی حیثیت سے شرکت کی دعوت دی جاتی ہے نیز اس نوع کی تقریبات میں انعقاد عمل سے کرنے کے لیے مشورے بھی طلب کیے جاتے ہیں۔

س: کیا آپ اب بھی بچوں کے لیے لکھی گئی کتابیں پڑھتے ہیں؟

ج: تدریسی خدمات سے (2000 میں) سبکدوش ہونے کے باوجود میں اپنے اسکول کے دارالمطالعہ میں پابندی سے حاضری دیتا ہوں۔ وہاں موجود اردو کے علاوہ ہندی، مراٹھی اور انگریزی میں شائع ہونے والے بچوں کے رسالوں کی ورق گردانی کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے لکھنے والے بڑے شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ نئے لکھنے والوں کی تخلیقات کو تلاش کر کے پڑھتا اور دل کو شاد کرتا ہوں۔

س: انگریزی اور دیگر زبانوں میں شائع ہونے والے کون سے رسالے بچوں کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں؟

ج: وہ بھی رسالے جن کے مشمولات میں درسِ انسانیت ہو۔ جو بچوں کو سائنس اور ٹکنالوجی کی جدید تر معلومات تمام تر خصوصیات کے ساتھ پیش کریں۔ جو بچوں کو وقت کی قدر اور ماحول کو آلودگی سے بچانے کے گر سکھائیں۔

س: اردو میں بچوں کے لیے انگریزی، تیلگو اور دیگر زبانوں جیسا شائع ہونے والا کوئی مکمل رسالہ موجود ہے؟

ج: ہے۔ اس کا نام کیا بتاؤں کیونکہ

میں اس کا نام جو لوں اور لوگ پوچھیں

کہ آپ اپنا تعارف ہو بہار کی ہے... اس کا نام 'بچوں کی دنیا' ہے۔ اس دنیا میں تقریباً سب کچھ ہے۔

س: بچوں کے ادب پر جو رسائل شائع ہو رہے ہیں، ان کے مواد اور زبان و بیان سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

ج: ادھر کتب بیزاری کی جو ہوا چلی ہے وہ ویوں کی ہے۔ بچوں کے رسالے بھی اب اس ذوق و شوق سے نہیں خریدے اور پڑھے جاتے ہیں، جیسا کہ ہمارے بچپن میں ہوتا تھا۔ البتہ کچھ رسالے ایسے ضرور ہیں جن کا آج بھی نام ہے۔

س: معاصر ادب اطفال سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

ج: فی زمانہ ادب اطفال تخلیق کرنے والوں کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔

س: بچوں کے لیے لکھتے ہوئے آج کے دور میں کن موضوعات پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے؟

ج: وہ موضوعات مفید ہوں گے، جو انھیں اچھے انسان، اچھے شہری، اچھے وطن پرست، اچھے علم دوست اور اچھے طالب علم بنانے میں معاون ہوں۔

س: بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کچھ مفید تجاویز اور مشورے؟

ج: بچے کی پہلی تربیت گاہ آغوشِ مادر ہے۔ پھر تعلیم گاہ کی باری آتی ہے۔ گھر میں بچے کو تربیت یافتہ بنا کر تعلیم گاہ میں داخل کرنے کے امید افزا نتائج سامنے آتے ہیں۔ یہ نتائج اس کے بڑے کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔

س: ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' میں آپ کس نوع کی تبدیلی چاہتے ہیں؟

ج: میرے مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ آج کے اسکولی بچوں کا خوش خط عرفِ عام میں رائٹنگ کہتے ہیں کچھ زیادہ اچھا نہیں ہوتا۔ اسکول کے بیشتر بچے بدخط ہوتے ہیں۔ بچوں کی دنیا میں ایک صفحہ ان کی خوش خطی کے لیے مختص ہو تو بہت اچھا۔

س: بچوں کے لیے آپ کا کوئی پیغام!

ج: کامیابی کی بلندی پر پہنچنے کا کوئی شارٹ کٹ نہیں۔ اس کے لیے محنت کرنی ہوگی۔

■

Mohd Rafee Abdul Khaliq Ansari
734, Bhusar Mohalla
Bhiwandi - 421302
Distt.: Thane (Maharashtra)

عطیہ پروین

علم کی دولت

موتیوں سے علم کے دامن میرے بچو بھرو
پڑھنے لکھنے میں ذرا بھی تم نہیں سستی کرو

یہ وہ دولت ہے اگر تم نے اسے پایا نہیں
تو یہ سمجھو زندگی بھر کچھ مزہ پایا نہیں

علم وہ دولت ہے جس کے پاس ہے وہ ہے امیر
اور اگر حاصل نہیں تو آدمی بالکل فقیر

یوں تو جاہل بھی کما لیتے ہیں جینے کے لیے
علم کا شربت نہیں ہے پاس پینے کے لیے

جانتے ہوگے رسول اللہ کا فرمان ہے
علم وہ دولت ہے جو انسان کی پہچان ہے

علم کو حاصل کرو جس جا سے بھی تم کو ملے
تم کو اس کے واسطے گر چین بھی جانا پڑے

اور تم لے کر سبق اپنے رسول پاک کا
علم سے دامن بھرو دامن بھرو نہ خاک کا

علم ہے وہ چاند جس ماتھے پہ آ کے سج گیا
تو وہ انساں جہل کی تاریکیوں سے بچ گیا

راستہ اس کا بہت پاکیزہ اور پرنور ہے
روشنی میں آ کے وہ تاریکیوں سے دور ہے
ہر طرف عزت ہے اس کی ہر طرف ہے واہ واہ
میرے بچو تم بناؤ علم کو جائے پناہ

مشورہ پروین کا تم لوگ دل سے مان لو
راستہ پرنور ہے جو بس اسی پر تم چلو

■

Atia Parween
Naya Makan
Vill. & P.O: Saidpur
Rudauli, Faizabad - 225407 (UP)

رحیم رضا

عزم نو

محبتیں بڑھائیں گے
کدورتیں مٹائیں گے

سبھی سے اپنی دوستی
سبھی کے کام آئیں گے

پڑے ہیں غفلتوں میں جو
انھیں بھی ہم جگائیں گے

جلا کے شمع علم کی
یہ ظلمتیں مٹائیں گے

گناہوں سے بچیں گے ہم
ہاں نیکیاں بڑھائیں گے

ڈریں گے نہ کسی سے ہم
کسی کو نہ ڈرائیں گے

پجاری ہم ہیں پیار کے
اسی کے گیت گائیں گے

وطن سے پیار ہے ہمیں
وطن پہ جاں لٹائیں گے

(تعارف... 2022ء کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

■

Raheem Raza
2587, Raza Manzil, Khirni Pura
Yawal, Distt. Jalgaon (Maharashtra)
Mob.: 9890007154

صابر

میٹھا بیر

سرد موسم میں ہے قدرت کی عطا میٹھا بیر
بن کی بیری میں جاؤ تو گرا میٹھا بیر

اس کے دیدار سے آجاتا ہے منھ میں پانی
تھوڑا ادھ گدرا سا، تھوڑا سا ہرا میٹھا بیر

آم، امرود، اناس کی تاثیر اس میں
شکل و صورت سے مگر سیب نما میٹھا بیر

کل مری کوّا پتنگ جا کے پھنسی بیری میں
وہ پتنگ چھلنی ہوئی اور ہنسا میٹھا بیر

آج ٹیچر نے الٹ دیں مری جیبیں ساری
اور چلائیں خوشی سے کہ اَہا میٹھا بیر

دوستوں میں ہوئے تقسیم مرے بیر تمام
دیکھتے دیکھتے سب ختم ہوا میٹھا بیر

اب یہ سوچا ہے نہ لے جاؤں گا اسکول کبھی
گھر میں ہی بیٹھ کے کھاؤں گا سدا میٹھا بیر

■

Sabir C/o Zain Tailor
Juna Bazar
Aurangabad - 431001 (Maharashtra)
Mob.: 9890449515

ارشاد احمد ارشاد

اردو سے ہے ماں کا رشتہ

تھر تھر کانپ رہے ہیں پھر بھی جاتے ہیں اسکول
اچھی اچھی وردی پہنے ننھے ننھے پھول

کاندھوں پہ ہے بستہ پیارا ہاتھوں میں دستانے
آنکھوں میں ہیں چپکے ہوئے علم جیسے ہیں پروانے

امی ابو ٹھان لی میں نے نہیں رہوں گا جاہل
محنت سے میں خوب پڑھوں گا علم کروں گا حاصل

میری کتابیں مجھ سے کہتیں اپنے دل کی بات
ہم کو اپنا دوست بنا لو رکھو اپنے ساتھ

میرا قلم ہے سچا ساتھی لکھے دل کی بات
بن بولے ہی سمجھے مجھ کو دیتا میرا ساتھ

میرا قلم ہے کتنا پیارا لکھتا میری بات
جب چاہوں میں کچھ بھی لکھنا دیتا میرا ساتھ

اردو ہندی دو بہنیں ہیں دونوں ہم کو پیاری
اردو سے ہے ماں کا رشتہ ہندی ماسی ہماری

■

Irshad Ahmad
Makan No.: 1206, Gali No.: 39/4
Jafrabad
Delhi 110053

پاندان

علیم طاہر

آؤ بچو آج کریں ہم 'پاندان' کی بات
پاندان نے کیسے نبھایا خاندان کا ساتھ

ہر گھر میں رکھا جاتا تھا پاندان پیارا
بڑے بزرگوں کا رہتا تھا جیسے راج دلارا

یاد ماضی نہ ہیں ہوتے آؤ کریں ہم یاد
اس کا بھی اک دور تھا بچو، رہتا تھا آباد

اس کے اندر ہر دم دیکھو، لونگ، سپاری کتھا
سونف، الائچی، چونا، تازہ پانوں کا ایک دستا

دادی نانی لے کر بیٹھی رہتی تھیں مسرور
بچوں کو رکھا جاتا تھا، پاندان سے دور

پاندان سے گھر آنگن میں سجتی تھی چوپال
اس بہانے جانا جاتا ایک دوجے کا حال

پیتل دھات کے ہوتے تھے یہ پہلے بڑی بھاری
چاندی کے بھی مل جاتے تھے، ہلکے معیاری

پہلے چرچا تھا اس کا اب، چرچا نہیں ذرا بھی
نہ کوئی چوپال سجے اور، خرچا نہیں ذرا بھی

جیسے وقت کے دھوئیں میں کوئی کھوئی ایک روایت
انسانی تہذیبی تھی، جس میں شامل وفا، محبت

■

Aleem Tahir
Momin Pura, Sr.No.19, H. No.51
Malegaon - 423203 (Nasik) Maharashtra
Moh.:9623327923

فہیم احمد

میں کیا چاہوں

کوئی بھی مجھ سے نہ پوچھے
کہ آخر میں کیا چاہوں

کبھی کسی نے یہ نہ پوچھا
کہ میں کیا بننا چاہوں

میرے اس ننھے سے دل میں
چھپی ہوئی ہیں باتیں خوب
دل کرتا خرگوش بنوں میں
پھر خوابوں میں جاؤں ڈوب

ہوم ورک جب کرنے بیٹھوں
آپا بتلا دیتیں کام
مچل اٹھے دل دوڑوں کھیلوں
جیسے ہی آتی ہے شام

پنکھ لگا کر اڑنے والا
پیارا سا سپنا چاہوں

روک لگاتے سبھی مگر میں
دریا سا بہنا چاہوں

ابو کہتے ہیں وکیل بن
جانا کچھ نہ بننا اور
امی کہتی بنو ڈاکٹر
کرو بات پر میری غور

■

Dr. Faheem Ahmad
Asst Prof. Dept. of Urdu
Mahatma Gandhi Memorial (P.G) College
Chaudhary Sarai
Sambhal - 244302 (UP)

قسط 4

جنگل کی کہانی

رمیش نارائن تیواری

مترجمہ

زینت شہریار

پیارے بچو! ہر عمر کے لوگوں کو قصے اور کہانی سننے کا شوق ہوتا ہے، خاص طور پر بچپن میں کہانیوں سے دلچسپی ہوتی ہے اورسبق آموز کہانیوں سے بہت کچھ سیکھتے بھی ہیں۔ اسی وجہ سے دادی، نانی اور امی وغیرہ سے کہانیاں سنانے کی فرمائش کرتے ہیں۔ بچوں کی پسندیدہ چیزوں میں جنگل اور جنگلی جانور کافی اہمیت کے حامل ہیں، بچے ٹیلی ویژن پر بھی ایسے کارٹون اور کہانیاں شوق سے دیکھتے ہیں۔

’جنگل کی کہانی‘ رمیش نارائن تیواری کی عمدہ کتاب ہے جس کا اردو ترجمہ زینت شہریار نے کیا ہے، بھیڑیا، شیر، بندر، اژدھا، موگلی اور قا وغیرہ اس کتاب میں بیس کہانیاں شامل ہیں جو آپس میں مربوط ہیں۔ بچوں کی دلچسپی اور پسند کے پیش نظر ’جنگل کی کہانی‘ کے عنوان سے ایک نیا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے امید ہے کہ اسے آپ پسند کریں گے اور ان سے سبق بھی حاصل کریں گے۔

اب تک آپ ’بھیڑیا اور گیدڑ‘، ’شیر خاں کی دھمکی‘ کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ ’بھیڑیا گروہ میں موگلی‘ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جنگل کا یہ عام قانون تھا کہ بھیڑیا کا بچہ جب اپنے پیروں پر کھڑا ہونے لگے تو اسے گروہ کے سامنے پیش کرنا لازمی ہے، تاکہ اس گروہ کے سارے بھیڑیے اس بچے کو پہچان لیں اور پریشانی کے وقت اس کی مدد کریں، بھیڑیا کے گروہ کا اجلاس مہینے میں ایک بار ہوتا تھا، دادا بھیڑیا اپنے بچے، اماں بھیڑیا اور موگلی کو لے کر جلسہ گاہ پہنچا، بھیڑیا کے گروہ کے رہنما کا نام ’اکیلا‘ تھا۔ وہ بہت طاقتور اور چالاک تھا،وہ اپنے گروہ کی حفاظت بڑی ہوشیاری سے کرتا تھا،اس گروہ میں تقریبا چالیس بھیڑیے تھے،سب بھیڑیے بچے کو بغور دیکھ رہے تھے تاکہ وہ اسے اچھی طرح پہچان لیں،اسی درمیان شیر خان کی گرج سنائی دی،وہ کہہ رہا تھا یہ بچہ میرا ہے اسے مجھے دے دو،بھیڑیے کے گروہ میں اس بچے کا کیا کام؟لیکن اس کی بات پر اکیلا نے بالکل بھی دھیان نہیں دیا،پھر کچھ بھیڑیے نے موگلی کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے گروہ میں آدمی کے بچے کی کیا ضرورت ہے،لیکن بھالو اور چیتے نے موگلی کی حمایت کی،پھر بھیڑیے کے گروہ اسے اپنے پاس رکھنے کے لیے تیار ہو گئے۔اب آگے (ادارہ)

شیر خاں کی سازش

متذکرہ واقعہ کے بعد دس گیارہ برس کے طویل عرصے میں بہت سے واقعات رونما ہوئے۔لیکن آپ کو ان کی تفصیل سے گریز کرتے ہوئے اس کے آگے کی کہانی پر اکتفا کرنا پڑے گا۔موگلی بھیڑیوں کے درمیان ہی بڑا ہوا تھا۔اس سے پہلے کہ وہ بچپن چھوڑ کر لڑکپن میں قدم رکھے، اس کی عمر کے بھیڑیا بچے جوان ہو چکے تھے۔ دادا بھیڑیا نے اسے جنگل کے سارے رازوں سے واقف کرا دیا تھا۔جب کچھ سیکھنا نہیں ہوتا، ایسے خالی وقت میں وہ دھوپ میں لیٹ کر سویا کرتا۔ جاگنے پر کچھ کھاتا پیتا اور پھر سوجاتا اپنا جسم گندہ معلوم ہونے پر وہ جنگل کے تالاب میں غوطے لگاتا۔شہد کھانے کی خواہش ہوتی تو وہ بھالو دادا کے سکھائے ہوئے طریقے سے درخت سے شہد کا چھتہ توڑ کر کھاتا۔اکثر وہ مجلس گاہ پر ہونے والی بھیڑیا گروہ کے اجلاس میں شرکت کرتا۔یہیں اس نے پہلے پہل محسوس کیا کہ وہ کسی بھیڑیے کی طرف آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زیادہ دیر دیکھتا ہے تو اس بھیڑیے کی آنکھیں اپنے آپ جھک جاتی ہیں۔تماشے کے لیے وہ اکثر ایسا کیا کرتا۔اپنا باقی وقت وہ اپنے دوستوں کے پنجوں میں لگے کانٹے نکالا کرتا، یا پھر ان کی روئیں دار کھال میں گھسے کیڑے چن کر مارا کرتا۔انسانوں کے تئیں اس کے دل میں بے اعتمادی کا جذبہ تھا۔بگھیرا نے اسے بتا دیا تھا کہ آدمی جنگل کے لوگوں کو پھنسانے کے لیے کھٹکے سے بند ہونے والے شکنجے بچھاتے ہیں۔کوئی جانور اس میں پھنس جائے تو اسے مار ڈالتے ہیں۔موگلی جوں ہی ذرا سمجھنے کے لائق ہوا بگھیرا نے اسے بتا دیا کہ وہ (موگلی) کسی مویشی کا شکار کبھی نہ کرے کیونکہ خود اس کی جان ایک بیل کی جان کے عوض خریدی گئی تھی۔بیل بھی مویشی ہوتے ہیں۔چنانچہ مویشی مارنا اس کے لیے احسان فراموشی جو ہوتی۔

"لیکن آدمی کیا کوئی ایسی چیز ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے بیچ نہ رہ سکے، ان کے ساتھ گھوم پھر کھیل کود نہ سکے؟" موگلی نے دریافت کیا۔ "میں جنگل میں پیدا ہوا ہوں۔ جنگل کے سارے قانون کا میں نے پورا احترام کیا ہے۔ میرے گروہ کا ایک بھیڑیا ایسا نہیں ہے جس کے پنجے میں سے میں نے کانٹا نہ نکالا ہو۔ یہ سب بھیڑیے تو میرے بھائی ہیں۔"

اماں بھیڑیا نے موگلی کو دو ایک بار شیر خاں کی طرف سے آگاہ کیا تھا۔اس نے بتایا تھا کہ شیر خاں ایسا باگھ نہیں ہے جس پر بھروسہ کیا جائے۔ اسے چاہیے کہ وہ شیر خاں کو موقع ملتے ہی فوراً مار ڈالے۔ادھر شیر خاں موگلی کی جان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا تھا۔اس نے دیکھ لیا تھا کہ اکیلا کی طاقت روز بروز گھٹ رہی تھی۔اس کا اس نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔نوجوان بھیڑیوں کی چاپلوسی کر کے اور اپنے مارے ہوئے شکار کی جوٹھن چٹا چٹا کر اس نے انھیں اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔ اکثر وہ ان کے ساتھ بات چیت میں تعجب ظاہر کرتا کہ ان جیسے ہوشیار شکاری اور طاقتور بھیڑیے ایک قریب المرگ بھیڑیے اور ایک آدمی کے بچے کی رہنمائی سے مطمئن کیسے ہیں۔وہ کہتا ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم لوگ اس انسان بچے کی آنکھ سے بھی آنکھ بھی نہیں ملا پاتے ہو۔“ اس تلخ حقیقت کو سن کر اس کے پیچھے پیچھے لگے رہنے والے بھیڑیے بے عزتی سے تلملا اٹھتے اور غصے سے غرا

کر چپ رہ جاتے۔

بگھیرا کو شیر خاں اور جوان بھیڑیوں کی سازش کے بارے میں معلوم ہوتا رہتا تھا تاہم موگلی اس طرح سے بے فکر تھا۔ اس نے کئی بار موگلی کو آگاہ کیا، موگلی ہنس کر ٹال جاتا۔ ایک دن بگھیرا ناراض ہوکر بولا ''آنکھیں کھول، چھوٹے بھائی۔ شیر خاں تجھے جنگل میں مارنے کی ہمت نہیں کرتا، لیکن یہ مت بھولو کہ اکیلا بوڑھا ہو چلا ہے۔ وہ جس دن اپنے شکار میں ناکام ہوا بس اسی دن اسے رہنما کے عہدہ سے ہٹا دیا جائے گا۔ شیر خاں کے بہکاوے میں آکر نوجوان بھیڑیوں کا یہ عقیدہ پکا ہوگیا ہ کہ انسان بچے کو اپنے بیچ نہیں رہنے دینا چاہیے۔ کچھ عرصے بعد تو ان کے لیے اور کچھ نہیں محض ایک آدمی رہ جائے گا۔''

''لیکن آدمی کیا کوئی ایسی چیز ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے بیچ نہ رہ سکے، ان کے ساتھ گھوم پھر کھیل کود نہ سکے؟'' موگلی نے دریافت کیا۔ ''میں جنگل میں پیدا ہوا ہوں، جنگل کے سارے قانون کا میں نے پورا احترام کیا ہے۔ میرے گروہ کا ایک بھیڑیا ایسا نہیں ہے جس کے پنجے میں سے میں نے کانٹا نہ نکالا ہو۔ یہ سب بھیڑیے تو میرے بھائی ہیں۔''

تب بگھیرا نے موگلی کو اپنی زندگی کے بارے میں بتایا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح خود وہ (بگھیرا) مہاراجہ اودے پور کے شاہی محل میں کٹہرے میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح اس نے آدمیوں کے درمیان پرورش پائی اور بڑا ہوا تھا لیکن ایک رات اچانک اس کے دل میں یہ احساس ہوا کہ وہ بگھیرا ہے، کالا چیتا ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ آدمیوں کی تفریح کا سامان نہیں ہے۔ بس وہ اسی رات کٹہرے کا تالا توڑ کر جنگل کی سمت چل دیا تھا۔ ''جس طرح میں اپنے جنگل میں واپس آ گیا۔'' اس نے موگلی کو پیار سے سمجھانے کی کوشش کی ''اسی طرح تجھے بھی آخرکار انسانوں کے پاس واپس چلے جانا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ گروہ کے بھیڑیے تجھے مار ڈالیں۔''

''لیکن بھلا کیوں؟ مجھے کوئی کیوں مار ڈالے گا؟''

''اس لیے کہ کوئی تیری آنکھ سے آنکھ نہیں ملا پاتا ہے۔ یہاں تک کہ میں جو تجھے پیار کرتا ہوں، میں بھی تیری آنکھ سے آنکھ نہیں ملا پاتا ہوں۔ میں آدمیوں کے درمیان ہی پلا اور بڑا ہوا تھا، پھر بھی نہیں۔ چھوٹے بھائی دوسرے لوگ تجھ سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ ان کی آنکھیں تیری آنکھوں کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی ہیں۔ وہ تجھ سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ تو عقل مند ہے کیونکہ تو نے ان کے پنجوں سے کانٹے کھینچ کھینچ کر نکالے ہیں، کیونکہ تو آدمی ہے۔'' بگھیرا بولا۔

موگلی پر اپنی باتوں کا اثر ہوتے دیکھ کر اس نے مزید کہا۔ ''معلوم ہے تجھے، کہ آج اکیلا اپنا شکار چوک گیا ہے وہ سانبھر کا شکار کرنے میں ناکام ہوگیا۔ لہٰذا یہ یقینی بات ہے کہ سارا گروہ اب اس کے اور تیرے خلاف بغاوت کر اٹھے گا۔ تو اب ایک کام کر فوراً نیچے والی گھاٹی میں چلا جا جہاں انسانوں کی جھونپڑیاں ہیں۔ آدمی لوگ وہاں لال پھول پیدا کرتے ہیں تو ان میں سے کچھ لال پھول لے آ۔ تاکہ جب وقت آئے تو اس وقت تیرے پاس ایک ایسا دوست ہو، جو مجھ سے بھالو دادا اور گروہ کے ان سبھی بھیڑیوں سے بھی، جو تجھے پیار کرتے ہیں زیادہ طاقت ور ہو۔ جا، فوراً لال پھول لے آ۔''

■

ماخذ: جنگل کی کہانی: رمیش نارائن تیواری

مترجمہ: زینت شہریار، **دوسری اشاعت**: 2022

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مختار ٹونکی

کہانی

لوہے کی لاٹ

نانی نے پان چباتے ہوئے کہا "لو سنو آج ایک عجیب کہانی، لوہے کی لاٹ کی کہانی، جو ہے تو مجھ سے بھی پرانی مگر کسی نے اس کی حقیقت آج تک نہ جانی۔ تم یہ تو جانتے ہو کہ ہمارے ملک ہندوستان میں اجنتا و ایلورا کے غار اور تاج محل و قطب مینار جیسی عجوبۂ روزگار یادگاریں ہیں۔ یہ تو خیر دنیا بھر میں مشہور ہیں مگر ان کے علاوہ اور بھی انوکھے عجوبے ہیں جو ہمیں آج بھی حیرت زدہ کر دیتے ہیں۔ ابھی تو خیر تم بچے ہو، کچھ بڑے ہو جاؤ تو اپنی ممی، ڈیڈی کے ساتھ ہندوستان کی راجدھانی نئی دلی کی سیر کو جانا اور پھر پرانی دلی کی طرف چلے جانا۔ مہرولی کے قریب اور قطب مینار کے پاس ایک لوہے کی لاٹ بھی بڑی شان سے کھڑی ملے گی۔ یہ بھی دنیا کے لیے ایک عجوبے سے کم نہیں۔"

سیانی نانی تھوڑی دیر کے لیے رکیں، اگالدان سنبھالا اور پان کی پیک اس میں تھوکتے ہوئے پھر اس طرح گویا ہوئیں "ہاں! تو میں کہہ رہی تھی کہ یہ لوہے کی لاٹ جس ٹھاٹ باٹ سے کھڑی ہے ایک عجوبۂ روزگار کی طرح ہے۔ تم میں سے ابھی کسی کی عمر 16 برس کی بھی نہیں ہوئی مگر تمھیں یہ جان کر شاید حیرانی ہو کہ یہ لوہے کی عجیب و غریب لاٹ تقریباً 1600 برسوں سے کھلے آسمان کے نیچے جوں کی توں کھڑی ہے۔ اس درمیان اس نے ہر موسم کے تھپیڑے سہے ہیں، سخت چلچلاتی دھوپ برداشت کی ہے اور آندھی و طوفان کو بھی جھیلا ہے۔ زمانے گزر گئے مگر اس میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں ہوئی۔ ارے بھئی! اس کا وزن بھی کم نہیں ہوا اور نہ ماحولیاتی آلودگی اس کو نقصان پہنچا سکی ہے۔ تم پوچھو گے کہ اس لاٹ کو کس نے اور کیسے بنایا ہوگا۔ ارے ہاں! آج تک کوئی اس کا بھید نہیں کھول سکا۔ اس عجیب و غریب اور انوکھی نرالی لوہے کی لاٹ کی تعمیر کس طرح ہوئی۔ 1600 برس پہلے بھلا کون کارخانے کہاں تھے کہ ان کو ڈھالتے لیکن اس سے یہ تو بہرحال ثابت ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں دھاتوں کا علم بہت بڑھا چڑھا تھا۔ اس لاٹ کا قطر 16 انچ، اونچائی 23 فٹ اور وزن تقریباً چھ ٹن ہوگا۔

یہ کب بنی اور کس نے کیوں بنایا۔ اس کی بھی ایک حقیقت بھری کہانی ہے۔ یہ بھی پڑھے لکھوں کو پتہ ہے کہ یہ گپت عہد حکومت کی یادگار نشانی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسے کمار گپت (اول) نے 414-455 کے درمیان اپنے والد کی یاد میں تعمیر کرایا تھا۔ اس لاٹ پر گپت عہد کے رسم الخط میں

سنسکرت کی ایک عبارت لکھی ہوئی ہے جس سے ہمیں چندر گپت وکرمادتیہ (380-414) کے بارے میں بہت اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ لوہے کی لاٹ پر کندہ سنسکرت تحریر کو ہندی اور انگریزی میں ترجمہ کر کے سنگ مرمر کے تختوں پر لکھا کر قریبی دیوار میں لگوایا گیا ہے تاکہ سب کو پتہ ہو جائے۔ پنڈت بنکے رام تول گوسوامی نے 1903 میں اس کام کو انجام دیا تھا۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ ایک انمول تحفہ ہے۔ تم ہو گے کہ لاٹ پر کیا تحریر لکھی ہے تو سنو لاٹ پر لکھے سنسکرت کے کتبے کا ہندی ترجمہ اس طرح ہے۔"

یہ کہہ کر ہماری پیاری نانی نے اپنے تھیلے میں سے ایک پرچہ نکال، آنکھوں پر اپنا چشمہ چڑھایا اور پھر پڑھنا شروع کیا:

"جس کی بھجا پر کھڑگ نے کیرتی لکھی۔ جب اس نے بنگ دیش کی لڑائی میں اکٹھے ہو کر آئے ہوئے شتروؤں کو چھاتی سے ڈھکیل کر پراجت کیا۔ جس نے لڑائی میں سندھ ندی کی سات دھاراؤں کو پار کر کے واہلیوں کو جیتا جس کے بل روپ وایو سے آج تک بھی دکشن سمندر سگندھت ہو رہا ہے۔ جو راجا تھک کر اس لوک کو چھوڑ کر دوسرے لوک کو چلا گیا ہے۔ اور شریر سے اپنے کرموں سے جیتے ہوئے سورگ میں چلا گیا، پرنتو کیرتی سے اسی بھومی پر براجمان ہے جس نے نج بل سے چرکال تک چکرورتی راجیہ پراپت کیا۔ نام جس کا ہے چندر، جس کے مکھ کی چھبی پورنی چندرما جیسی ہے۔ اس بھوپ نے بھکتی سے اپنے من کو وشنو میں لگا کر وشنو پد نامک پہاڑ پر بھگوان وشنو کا اونچا دھوج استھاپت کیا۔"

نانی نے اتنا بول کر پرچے کو تہہ کیا اور پھر ہم سے کہنے لگیں "نام جس کا ہے چندر، تم نے سنا، اس سے مراد چندر گپت بکرماجیت ہے اور اسی وجہ سے اس لاٹ کو چندر کا لوہ استمبھ بھی کہتے ہیں۔ بہت لوگ آج بھی اسے حیرت سے دیکھتے ہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس لاٹ سے پیٹھ لگا کر اور بازوؤں کو پیچھے لے جا کر اسے اپنے گھیرے میں باندھ لے تو اس کے لیے یہ عمل نیک شگون ہوگا۔

■

Mukhtar Tonki
Kali Paltan Road
Pul Mohd Khan
Tonk- 304001 (Rajasthan)

کہانی

اپریل فول

افتخار انیس حمیدی

بات اس وقت کی ہے جب ہم لوگ مراد آباد کے محلہ کٹھیر سید خان میں رہتے تھے۔ یہ بہت پرانے زمانے کا گھر ہے اور محلے کا سب سے بڑا گھر تھا لوگ اس کو حویلی بھی کہتے تھے۔ اس کے باہر باغیچہ جسے سب چمن کہتے تھے، وہاں ایک کنواں بھی تھا۔

چمن کے بعد ایک اچھا بڑا مردانہ حصہ تھا۔ اس میں ایک چوکیدار کا کمرہ بھی تھا۔ اس کے بعد ایک بڑا سا پھاٹک تھا۔ اس کے اندر بھی بہت دور دوسرا دروازہ اور تیسرا دروازہ تھا۔ سیدری اس میں ایک غسل خانہ اور پاخانہ وہاں چاروں دیواروں سے گھرا ہوا ایک کمرہ سامان کیا تھا جس میں وقت ضرورت دو کھٹ آسکتی تھیں۔ تیسرا دروازہ اندر کو کسی زمانے میں زنانہ میں کھلتا تھا۔ ساتھ میں ایک زینہ اوپر جانے کے لیے تھا۔ رات کو باہر کا بڑا پھاٹک بند ہو جاتا تھا جس سے کوئی اندر نہ آسکے۔

یہ حویلی نواب آصف خان کی تھی وہ جوانی میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ اب مالک نواب آصف خان کی بیوہ جنابہ عارفہ جہاں صاحبہ تھیں ان کے دو لڑکے نواب اکمل خان اور نواب عاطف خان اور دو بیٹیاں غزالہ اور شاہدہ تھیں جن کی شادی ہو چکی تھی۔ بڑے بیٹے نواب اکمل خان علی گڑھ میں نوکری کرتے کرتے وہیں سول لائن میں رہتے تھے۔ چھوٹے لڑکے نواب عاطف خان ریلوے میں گارڈ تھے۔ اپنی بیگم گلناز بچوں پرویز، نواب آغاز خان اور اپنی والدہ عارفہ کے ساتھ اسی حویلی کے اوپری حصے میں قیام پذیر تھے اور حویلی کی نگرانی بھی کرتے تھے۔ وقت کے ساتھ زمینداری ختم ہوتی گئی۔ آمدنی کم ہوتی گئی اور خرچ بڑھتے گئے تو مجبوری میں حویلی

کے پیچھے کے حصے میں چوراچھے بڑے گھر بنا کر کرائے پر دیے تھے۔ اس کے ایک حصے میں ہمارا خاندان رہتا تھا، والدین کو ملا کر ہم سات لوگ تھے۔ پاپا شمس خان ،یوٹ مسعود اسٹر کالج میں انگریزی کے لیکچرار اور ممی سروار بانو ہینٹ پرائمری اسکول میں ٹیچر تھیں۔ ہمارے گھر میں تین بڑے سمجھدار بچے جن میں دو لڑکے اور ایک لڑکی اور دو چھوٹے بچے جن میں ایک لڑکی اور ایک لڑکا دوسرے مکان میں وکیل نواب خالد رہتے تھے جن کے گھر میں ان کی بیگم ندرہ خانم اور ایک بڑا لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں۔ تیسرے گھر میں انجینئر غلام علی اپنی بیگم زبیدہ اور دو لڑکیوں ثریا اور ثمینی کے ساتھ آرام سے رہتے تھے۔ چوتھے گھر میں میونسپل بورڈ میں ٹیکس آفیسر فرحت الدین اپنی بیگم راحت جہاں کے ساتھ رہتے تھے ان کا ابھی کوئی بچہ نہ تھا۔

سب کرائے دار آپس میں بہت ہی گھل مل کر رشتے داروں کی طرح رہتے تھے۔ ہم بچے بھی کسی کو انکل آنٹی کسی کو خالہ خالو اور کسی کو پھوپھا پھوپھی کہتے تھے۔ باری باری سے اتوار کو ہر گھر میں بچوں کی پنچایت ہوتی۔ جہاں سب بچے پارٹی آپس میں کیرم بورڈ لوڈو وغیرہ کھیلتے اور پڑھائی کے ساتھ ساتھ موج مستی کرتے۔ ہم سب بچے درجہ پانچ سے درجہ نویں تک کے طالب علم تھے۔ ہمارے ماموں جان بابر حسین بھی ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے اور ہندو کالج سے بی ایس سی کر رہے تھے یہ ان کا پہلا سال تھا۔ ہم سب بچوں کی شیطان کی ٹولی تھی اور ماموں اس کے استاد تھے۔ ہم سب شیطان کی ٹولی کر شرارت کرتے تھیں اور زکھوں کی ملی جلی معصوم شرارتیں۔

ہر دفعہ مارچ کے آتے ہی ماموں جان کی سرپرستی میں کسی کو اپریل فول بنانے کوئی نئی ترکیب سوچتے اور اپریل فول بنا کر بڑے دھوم دھام سے جیت کا جشن بھی منایا جاتا۔ اور اس طرح دن گزر رہے تھے۔

اس سال شیطان ٹولی نے کچے آٹے کے پیڑے بنا کر ان پر شکر ڈال کر سامنے والی شان خالہ کو دے آئے تھے اور کہا تھا: "آج میرا نتیجہ نکلا ہے اور میں پاس ہو گیا ہوں" انھوں نے ایک پیڑا اٹھایا اور منہ میں رکھ لیا۔ تبھی باہر کھڑے سب ہی بچے چلائے۔ "اپریل فول بنایا، بڑا مزہ آیا۔" اور وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

ایک سال پہلے ہم نے روئی کے گولے بنا کر ان پر دہی اور سونٹھ چٹنی ڈال کر دہی بڑے تیار کیے۔ سب کو لے کر اپنی حویلی سے باہر پڑوس ثریا باجی کے گھر پہنچ گئے اور بولے "ممی نے آپ کو دہی بڑے بھیجے ہیں۔" یہ کہہ کر دہی بڑے ان کو کھانے کو دے دیے تھے۔ جیسے ہی انھوں نے ان دہی بڑوں کو کھایا تو ہم نے بہت زور سے کہا تھا "اپریل فول، بنایا، بڑا مزہ آیا" وہ بے چاری ثریا باجی!

وہ بھول گئی تھیں کہ آج پہلی اپریل ہے۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنس دیں۔ اور ہم وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔ اور جیت کا جشن منائے گئے۔

اب 26 مارچ 1967 کو بچوں کی میٹنگ ہمارے گھر میں منعقد ہوئی جس میں گڈو پپو سونی بوبی نیکی للی۔ پپی اور میں شامل ہوئے۔

[یہ نام بچوں کے پیار کے نام ہیں اور اصلی نام یہ بات راز ہی رہنے دو۔]

سب بچوں کو اس سال اپریل فول بنانے کی کوئی نئی ترکیب سوچنے کے لیے وقت دیا گیا۔ اگلی میٹنگ 28 مارچ 1967 کو شام پانچ بجے خالہ جان کے گھر رکھی جانے طے ہوئی۔ 28 مارچ بھی آ گیا۔ تب ایک بار پھر سبھی بچے مقررہ وقت پر خالہ جان کے گھر پر جمع ہو گئے اور اپریل فول بنانے کا ہو فل

پروف پلان بنا تھا وہ فائنل ہو گیا۔

اس سال یوپی بورڈ کے دسویں اور بارہویں کے سالانہ امتحانات 22 مارچ سے شروع ہو کر 16 اپریل 1967 تک ہوں گے۔ باقی کلاس کے امتحانات 20 اپریل سے ہونے تھے اس وجہ سے ہم سب کی چھٹی ہو گئی تھی۔

31 مارچ بھی آ گئی۔ یہ رات اتنی لمبی تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ رات بھر ہم سب بے چین رہے سو بھی نہیں سکے۔ کروٹیں بدلتے رہے اور صبح کا انتظار کرتے رہے۔ پہلی اپریل کی صبح کو ابھرتے سورج کی کرنیں جیسے ہی ہماری حویلی پر پڑیں۔ مشن اپریل فول کے تحت ہم سب نے اپنی اپنی پوزیشن لے لی۔ صبح دس بجے جیسے ہی انجینئر انکل گھر سے نکلے ہم نے کچھ دیر بعد انکل کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا آواز سن کے گھر کے اندر سے زبیدہ آنٹی کی آواز آئی "کون آ کون ہے؟" "جی میں ہوں جی! آنٹی" "کیا بات ہے؟" جی! انکل کی بائک اسٹینڈ پر کھڑی ہوئی ہے اور ان کی ٹانگ کولھے میں آ گئی۔ ساتھ ہی ان کا سر اوپر ٹانگ کے نیچے آ گیا ہے۔" ہم نے بہت ہی گھبراتے ہوئے بدحواسی میں زبیدہ آنٹی کو بتایا اور اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا "آپ جلدی سے سو روپیہ دے دیجیے" یہ سن کر آنٹی بہت گھبرا گئیں اور انھوں نے جلدی سے سو روپیہ پکڑوا دیے۔

روپے لے کر وہ وہاں سے تو دو گیارہ ہو گیے۔ حاجی حلوائی سے ان سو روپیہ کی مٹھائی خریدی گئی اور ہم سب شام تک حویلی سے غائب ہو گئے۔ پلان کے تحت شام کو ہم سب آنٹی کو اپریل فول بنا کر اور مٹھائی کھا کر شاندار جیت کا جشن منانے والے تھے اس کے لیے مٹھائی لے کر شام کو ہم نے انجینئر انکل کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو انکل نے ہی دروازہ کھولا اور کہا "ارے تم! آؤ بچو! اندر آ جاؤ" ہم سب بچوں کو اندر بلا لیا اور بولے "ارے آج تم نے تو اچھی آنٹی کو اپریل فول بنا ہی دیا تھا۔ اس لیے آج تم کو انعام دیتا ہوں۔ اب سنو یہ سب مجھے کیسے معلوم ہوا: جب میں گھر واپس آیا تو تمھاری آنٹی بہت گھبرائی ہوئی تھیں۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا "آپ کی بائک تو اسٹینڈ پر کھڑی ہوئی تھی؟ کیسے چھوٹی؟ میں نے کہا کہ بائک تو اسٹینڈ پر ہی کھڑی ہوتی ہے، ورنہ گر نہ جائے گی۔ پھر انھوں نے پوچھا "آپ کی ٹانگیں کولھے میں آ گئی تھی اور سر اوپر، ٹانگیں نیچے ہو گئی تھیں۔ کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟" میں نے کہا "سب کی ٹانگ کولھے میں ہی ہوتی ہیں اور سر اوپر ٹانگیں نیچے ہوتی ہیں۔ اس میں نئی بات کیا ہے؟"۔ تب تمھاری آنٹی نے مجھے سارا قصہ اور کرتوت تفصیل سے بتائی۔ پھر میری سمجھ میں تم لوگوں کا پلان آ گیا۔ یہ لو ٹافیاں سب بچوں کو بانٹ دو اور کھاؤ" انھوں نے کہا۔ ان کی بات سن کر ہم نے جیسے ہی ٹافیاں کھولیں تو ان ٹافیوں کے ریپر میں مونگ پھلی کے چھلکے!

"اپریل فول!" کہتے ہوئے انکل بڑے زور سے ہنسے۔ انھوں نے پھر کہا آج تو میں نے چھٹی لی تھی، آج میں دفتر گیا ہی نہیں تھا اور بائک گھر سے نکلی ہی نہیں۔

"اپریل فول بنایا، بڑا مزہ آیا۔" انھوں نے کہا۔ تم اپنی لائی ہوئی مٹھائی بھی کھاؤ اور وعدہ کرو کبھی کسی کو اپریل فول نہیں بناؤ گے۔"

آج میں سوچ رہا ہوں کہ کون بنا "اپریل فول؟"

(تعارف جون 2021 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

■

Dr. Iftikhar Anees Hameedi
196- Chilla
Amroha- 244221 (UP)

شاداب شمیم

ہمدردی

خالد بہت ہی ذہین اور محنتی لڑکا تھا، وہ گھر کا لاڈلا اور والدین کی آنکھوں کا تارا بھی تھا، وہ ہمیشہ اپنی کلاس میں اول آتا تھا، اس کے استاد بھی اس سے بے حد محبت کرتے تھے، اس کی حاضر جوابی کے سب قائل تھے، خالد پابندی سے اسکول جاتا اور گھر میں سب کا کہا مانتا تھا، وہ تین بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹا تھا، اس سے بڑی دو بہنیں تھیں، وہ بھی اپنے بھائی کا بے حد خیال رکھتی تھیں، تینوں بھائی بہن ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے، خالد کے ہولی ڈے ہوم ورک میں اکثر اس کی بہنیں مدد کر دیا کرتی تھیں۔

خالد کو جانوروں سے بھی بے حد لگاؤ تھا، پڑوس کی ایک بلی تھی جسے خالد پابندی سے کچھ نہ کچھ کھانے کے لیے ضرور دیتا، محلے میں ایک کالا رنگ کا کتا تھا جو اس کے گھر کے آس پاس ہی گھومتا رہتا تھا، اس کا بھی خالد خیال رکھتا تھا اور اس کے کھانے پینے کا بھی اکثر اہتمام کرتا تھا۔ خالد کی اس اچھی عادت کو گھر والے کے ساتھ ساتھ اس کے محلے والے اور رشتے دار بھی پسند کرتے تھے اور اس کی تعریف بھی کرتے تھے۔

خالد جب ان جانوروں کو دیکھتا تو سوچتا کہ ان کا گھر کہاں ہے، ان کے ماں باپ کون ہیں؟ یہ کہاں رہتے ہیں، یہ ایسے کیوں بھٹکتے رہتے ہیں، کیا کوئی ان کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے؟ یہ چیزیں اسے اکثر پریشان کرتی تھیں۔

خالد کا ایک بہت ہی اچھا دوست جابر تھا، دونوں ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے، دونوں کی دوستی اسکول میں بے مثال تھی، جابر کا گھر خالد کے گھر سے کچھ دور تھا، وہ دونوں ایک دوسرے کے گھر کبھی کبھی آتے جاتے تھے، خاص طور پر سال گرہ اور تہوار کے موقعوں پر ان دونوں کے گھر والوں کی بھی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ جابر کے پاس ایک بلی تھی، اس کا نام میکس تھا، میکس بہت ہی پیاری تھی، وہ سفید رنگ کی تھی، اس کے بال بے حد ملائم تھے، وہ زیادہ تر وقت جابر کے ساتھ ہی رہتی تھی، اسی کے روم میں سوتی تھی، وہ جب پڑھائی کرتا تو بلی اس کے ریڈنگ ٹیبل کے قریب ہی بیٹھی رہتی، کبھی اونگھتی، کبھی سوتی، کبھی کھیلتی اور کبھی روم میں دوڑنے لگتی تھی، جابر اسے بے حد پیار کرتا تھا، وہ اسکول سے آتے ہی سب سے پہلے میکس

سے ملتا، اسے پیار کرتا، پھر فریش ہو کر لنچ کرتا تھا، بلی بھی اس کے پاس بیٹھ کر اپنا کھانا کھاتی، دونوں کو ایک دوسرے کی عادت ہوگئی تھی۔

خالد جب بھی جابر کے گھر جاتا تو اس کی بلی کے ساتھ کھیلتا، اسے پیار کرتا، اس سے باتیں کرتا، اسے بلی بے حد پسند تھی، اس نے سوچا کہ وہ بھی ایک بلی پالے گا، اور اس کا خوب خیال رکھے گا۔

ایک رات خالد جب اپنے والد کے ساتھ بیٹھا ان سے باتیں کر رہا تھا تو اسی درمیان اس نے والد سے پوچھا کہ گلی میں کتے بلی وغیرہ کیوں گھومتے رہتے ہیں، کیا ان کا کوئی گھر نہیں ہے؟ کیا ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے؟ وہ کہاں سوتے ہیں؟ کہاں سے کھاتے ہیں؟

اس کے والد نے جواب دیا کہ یہ وہ جانور ہیں جن کا کوئی گھر نہیں ہے، یہ سب دن بھر ادھر ادھر بھٹکتے رہتے ہیں، کسی نے کچھ دے دیا تو کھا لیا، کوڑے وغیرہ میں کھانے کی چیز دیکھ لیا تو وہاں سے ان کی بھوک مٹ جاتی ہے، انھوں نے خالد کو سمجھایا کہ بیٹا یہ بے زبان جانور ہیں، یہ اپنی ضروریات، بھوک پیاس کا اظہار نہیں کر سکتے، اس لیے ہم انسانوں کو چاہیے کہ ہم ان کا خیال رکھیں، وقت پر انھیں کچھ کھانے کے لیے دیں، گرمی کے موسم میں اپنے گھر کے باہر ایک برتن میں پانی رکھ دیں تا کہ وہ اپنی پیاس مٹا سکیں، ٹھنڈ کے موسم میں یہ زیادہ پریشان ہوتے ہیں اس لیے کوشش کریں کہ محلے میں ان کے لیے ایک جگہ خاص کر دیں تا کہ وہ ٹھنڈ سے بچ سکیں۔ ہم انسانوں کو خدا نے اشرف المخلوقات بنایا ہے، خالد نے فوراً سوال کیا کہ بابا یہ اشرف المخلوقات کیا ہوتا ہے اور کسے کہتے ہیں؟ تو والد نے سمجھایا کہ اشرف المخلوقات کا مطلب ہے ساری مخلوق سے بہتر، یعنی اللہ نے جتنی بھی مخلوقات پیدا کی ہیں انسان، جانور، پرندے وغیرہ ان سب میں خدا نے انسان کو بہتر بنایا ہے، اس لیے کہ انسان میں خدا نے ایسی بہت سی خصوصیات رکھی ہیں جو دوسرے جانداروں میں نہیں ہیں جیسے انسان اپنی ضرورتوں کو بیان کر سکتا ہے، اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے، اچھے برے کی تمیز کر سکتا ہے، اپنی عقل کا استعمال کر سکتا ہے، دوسروں کے دکھ درد میں کام آ سکتا ہے یہ وہ خوبیاں ہیں جو دوسرے جاندار میں نہیں ہیں۔ اس لیے ہماری ذمے داریاں بھی بڑی ہیں، اپنے اخلاق و عادات سے ہمیں ہمیشہ اشرف المخلوقات ہونے کا ثبوت دیتے رہنا چاہیے، والد کی بات سے خالد بہت متاثر ہوا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ان بے زبان جانوروں کی ہمیشہ مدد کرے گا اور اپنے دوستوں سے بھی کہے گا کہ وہ ان کا خیال رکھیں۔

ایک دن خالد اپنے والد کے ساتھ بازار گیا، وہاں اس نے اپنی پسند کی کئی چیزیں خریدی، جوس کی دکان سے انار کا جوس پیا، اسے بازار میں گھومنا بہت اچھا لگ رہا تھا، اس نے والد سے کہا کہ اسے ایک کھلونا چاہیے، تو اس کے والد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا کہ بیٹے اب آپ بڑے ہو گئے ہیں، کھلونے سے تو چھوٹے بچے کھیلتے ہیں، جب وہ بضد ہو گیا تو اس کے والد نے کہا کہ ٹھیک ہے جو کھلونا آپ کو پسند آئے گا وہ میں دلوا دوں گا، اچانک خالد کی نظر خرگوش کے جوڑے پر پڑی، خرگوش بے حد خوب صورت تھا، جسے ایک دکاندار بیچ رہا تھا، خالد نے والد سے کہا کہ اسے خرگوش خریدنا ہے، خرگوش اس کا پسندیدہ جانور ہے، وہ اس کا بہت خیال رکھے گا، اسے پیار کرے گا، والد نے خالد کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ بیٹا ٹھیک ہے میں خرگوش آپ کو خرید دوں گا، لیکن پہلے آپ یہ بتائیں کہ کیا اس طرح کسی جانور کو قید کر کے رکھنا صحیح ہے؟ خدا نے اسے آزاد پیدا کیا ہے اور آپ اسے اپنے گھر میں بند رکھیں گے تو

اس پر زیادتی ہوگی، وہ اپنی مرضی سے کہیں آجا نہیں سکے گا۔ اس طرح اس کی آزادی کو آپ چھیننے والے بنیں گے۔

والد نے مزید سمجھاتے ہوئے کہا کہ اگر آپ کو گھر کے باہر نہیں جانے دیا جائے، آپ کو اپنی مرضی کے مطابق کوئی بھی کام کرنے نہیں دیا جائے، اپنے والدین اور رشتے داروں سے نہیں ملنے دیا جائے، اپنی پسند کا کھانا کھانے نہیں دیا جائے تو آپ پر کیا گذرے گی؟ آپ کو اچھا لگے گا؟ کیا آپ پریشان نہیں ہوں گے؟ خالد نے کہا کہ بالکل اسے پریشانی ہوگی، اس نے کہا کہ وہ تو اپنے والدین کے بغیر ایک دن بھی نہیں رہ سکتا، تو اس کے والد نے سمجھاتے ہوئے کہا کہ بالکل یہی معاملہ ان جانوروں کا بھی ہے، انھیں قید کر کے رکھنا غلط ہے، ان کو اپنے گھر اور اپنے ماں باپ سے الگ کرنا ان پر زیادتی ہوگی۔

والد کی بات خالد کی سمجھ میں آگئی، اس نے فوراً کہا کہ اسے خرگوش نہیں چاہیے اور وہ آج سے ایسا مطالبہ بھی نہیں کرے گا، اسے لگا کہ واقعی ان جانوروں کو پالنا گویا ان کو قید کرنا ہے، ان کی آزادی اور ان کے حقوق کو چھیننا ہے، ہم گرچہ ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں، ان کے لیے اچھے اور صاف ستھرے کھانے کا انتظام کرتے ہیں، ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے ہیں، بیمار پڑنے پر ان کا علاج بھی کرواتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کو قید کرنا ان پر زیادتی ہے، خالد نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ بھی کیا کہ وہ اب مجبوروں اور ضرورت مندوں کی مدد کرے گا اور جانوروں کا خاص خیال رکھے گا۔

■

Shadab Shamim
D-35, Shaheen Bagh
Jamia Nagar, Okhla
New Delh i- 110025
Mob.:9643885605

Subscription Form "Bachon Ki Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں بچوں کی دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بنا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.. بتاریخ ....

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'بچوں کی دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159 , Email.: magazines@ncpul.in

دستخط

نازنین فردوس

اسکول

اسکول ہم پیدا کیا ہوئے ہمارے کان میں تیرا ہی ذکر پڑتا رہا۔ ہماری امی اسکول کو لے کر اتنی پرجوش تھیں کہ ان کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ تو وہ جھولے میں سے سیدھا اسکول بس میں بٹھا دیتیں۔ پپا کا تو پوچھیں مت، وہ ہر آنے جانے والے سے یہی کہہ رہے ہوتے تھے کہ "جی بس دو سال کا ہو جائے ویں پھر تو اسے شہر کے ٹاپ اسکول میں ایڈمیشن ہی کرا دینا ہے بس۔" اور ہم جھولا جھولتے جھولتے سوچتے کہ پتا نہیں اسکول کون سی جگہ ہے جہاں بھیجنے کے لیے ممی، پپا اتنے بے تاب ہیں۔ ضرور کوئی اچھی جگہ ہوگی مزیدار سی۔ ہم منہ میں اپنا انگوٹھا چوستے چوستے سوچتے اور اچھل اچھل کر اپنا بھی جوش دکھاتے۔ ہمارے جوش کا یہ عالم تھا کہ ہم آغوں آغوں کرنے کے بجائے اسکول اسکول کرنے لگے تھے۔ (پتا نہیں ہمیں اتنا جوش دکھانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم نے کون سا اسکول جا کر آئنسٹائن بننا تھا۔)

دو سال تک مسلسل ہمارے کانوں میں اسکول سے جڑی ہر معلومات انڈیل دی گئی۔ "اسکول یہ ہوتا ہے اسکول وہ ہوتا ہے۔"

"اسکول جانے سے بچوں کو تعلیم حاصل ہوتی ہے۔ ان کا مستقبل سنورتا ہے وغیرہ وغیرہ..."

لیکن ہمیں تو یہ لگا کہ اسکول میں داخل کر کے مائیں اپنی جان چھڑا لیتی ہیں۔ بچوں کی شرارتوں سے تنگ جو آجاتی ہیں۔ ان کی یہی شکایت ہوتی ہے کہ "بچے اتنے شرارتی ہیں نا۔ کچھ نہ پوچھو مت۔" اب ان کو یہ کون بتائے کہ بچے شرارت نہیں کریں گے تو کیا بوڑھے کریں گے۔ مگر نہیں انھیں بچے بالکل تہذیب یافتہ چاہیے۔ بچے شرارت نہیں ہونی چاہیے۔ کسی بھی طرح کا ہلہ گلہ نہیں ہونا چاہیے۔ کھلونے ٹوٹنے نہیں چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ اب کون سمجھائے انھیں کہ بچے تو بس بچے ہوتے ہیں اگر انھیں تمیز، تہذیب آجائے تو پھر انھیں بچہ کون کہے۔ لیکن عقل کی یہ باتیں ہیں عقل والوں کو ہی سمجھ میں آئیں گی۔

"اسکول ہمیں تمھارے بارے میں بات کرنی تھی۔ ہاں ہم کہہ رہے تھے کہ تم نے ہم سے ہمارا بچپن چھین لیا۔ آزادی چھین لی اور ہمیں ایک قیدی کی طرح قید کر لیا۔ اب تم پوچھو گے کیسے؟ تو وہ ایسے کہ بچوں کو جونہی اسکول میں داخل کرتے ہیں۔ اسکول والوں کی اجارہ داری شروع ہوتی ہے بیگ سے لے کر جوتے تک اسکول سے لینے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔ کتابوں کی ایک لمبی لسٹ ہوتی ہے۔ نوٹ بکس کا تو پوچھو مت، رول، ان رول، سنگل سائز سے لے کر ہر سائز کے نوٹ بکس۔ اضافی میٹریل کے نام پر الم غلم سی بکس دی جاتی ہیں۔ ان تمام بکس، نوٹ بکس، ریڈرز وغیرہ کو ملا کر بیگ کا وزن آٹھ سے دس کلو تک ہو جاتا ہے اور ایسے بیگ نما تھیلے ہمیں روز لے جانے ہوتے ہیں اور آخر اسکول تین تا چار فلور تک بنے ہوتے ہیں۔ لفٹ عام طور نہیں لگائی جاتی اور اگر لگا بھی دیں تو بچوں کی سیفٹی کا بہانہ بنا کر بچوں کو لفٹ سے نہیں بھیجا جاتا۔ انھیں سیڑھیاں استعمال کرنی ہوتی ہیں۔ اب تم کہو گے کہ سیڑھیاں چڑھنا صحت کے لیے اچھا ہوتا ہے۔

سیڑھیاں چڑھنا اترنا صحت کے لیے اس وقت اچھا ہوتا ہے جب دس کلو کا بیگ پیٹھ پر لاد کر نا چلا جائے۔ سچ میں ہم لوگ دھوبی کے گدھے نظر آرہے ہوتے ہیں۔ اس طرح جاتے ہوئے۔

اس کے لیے ہماری گورنمنٹ نے کچھ رولز بنائے تو ہیں مگر اسکول میں کوئی فالو نہیں کرتا۔ گورنمنٹ کے رولز تو اسکول کے باہر بھی کوئی فالو نہیں کرتا۔ اس حمام میں تو سبھی ننگے ہیں۔ اب کیا ہے کہیں شرم آتی ہے۔

اگر اسکول کی فیس کی بات کی جائے تو تم اسکول ایک کاروبار بن گئے ہو اور تم دراصل سب سے زیادہ منافع بخش بن گیا ہے۔ اگر کسی کو کچھ نہ سوجھا تو اسکول کھول لیا اور بارگیننگ شروع، ”آپ کتنے لاکھ دے سکتے ہیں سے بات شروع ہوتی ہے اور آپ کے لیے سیٹ کہیں بالا رہ گئی تک“ ختم۔ فیس کو لے کر کوئی سمجھوتہ نہیں ہوتا ہاں تعلیم کے معیار کو بڑی آسانی سے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ایسے اساتذہ کو اپائنٹ کیا جاتا ہے جو خود ابھی پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ ان کا پڑھانے کا انداز تھوڑا مختلف ہوتا ہے۔ وہ صرف پڑھاتے ہیں سمجھاتے نہیں اور بچوں کو بھی اتنا ہی چاہیے ہوتا ہے کہ سر صرف جلدی جلدی پورشن ختم کریں اور بچوں کی جان بخش دیں۔ ٹیچرز میں صبر و تحمل کا فقدان ہوتا ہے وہ اپنے گھریلو الجھنوں سے پریشان رہتے ہیں اور اپنا سارا غصہ ہم بچوں پر اتارتے رہتے ہیں۔

اسکول فیس سے لے کر اسکول ہوم ورک تک ہم کیا کیا بتائیں تیرے بارے میں تو نے تو ہماری ناک میں دم کر دیا ہے۔ ہوم ورک اس طرح دیا جاتا ہے جیسے کہ ہم آکٹوپس ہوں اور ہمارے آٹھ ہاتھ ہوں۔ ہر مضمون کی ٹیچر فوراً فوراً اپنا ہوم ورک تھمیں سونپتی ہے اور ہم بچوں کو سمجھ نہیں آتا ہے کہ کس کا ہوم ورک کریں اور کس کا چھوڑیں۔ آخر ہیں تو دو ہی ہاتھ ہمارے۔ ایک طرف ہوم ورک دیا جاتا ہے تو دوسری جانب ٹسٹ بھی رکھا ہوتا ہے۔ آخر پڑھیں تو پڑھیں کیسے؟ آخر ہم پر رحم کیوں نہیں کرتے آپ لوگ معصوم بچے پر اتنا ظلم، کب باز آئیں گے؟ ”اسکول! اے اسکول!“ تو نے صرف ہمیں ہی نہیں ہمارے بڑوں پر بھی دباؤ بنایا ہوا ہے۔ یہاں ہمارے بڑوں کی بھی نیندیں اڑ گئیں ہیں انھیں بھی ایک پل کا چین نصیب نہیں ہے۔ سب کی نیند سب کا آرام چین تو تو نے اڑا دیا ہے اور اب بڑے معصوم بنتے ہو۔ اسکول کے پروجیکٹ کا تو ہم بھول ہی گئے تھے وہ پروجیکٹ ہمارا ہوتا ہے اور کرنا ہمارے والدین کو ہوتا ہے۔ اس کو بھی آپس میں برابر برابر تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہمارے خاندان کی ڈیوٹی لگ جاتی ہے جیسے ابو حساب میتھس دیکھیں گے سائنس چاچا دیکھیں گے۔

ہندی ممّا دیکھیں گی اور اردو دادا ابو، ”چھوٹو آرٹ ورک کریں گی اور خالہ دیکھ رہی ہیں۔ باقی بچا کام چاچی لا نا تو پیا کن ان اس کے لیے تو ہم رہتے ہیں نا۔ اتنے تمام لوگ مل کر ٹیم ورک کرتے ہیں تب جا کر اسکول کے پروجیکٹ ختم ہوتے ہیں اللہ اللہ کر کے ہم جا کر داخل کر آتے ہیں۔

اس پے ”اے اسکول!“ کہنا سنا تو بیکار ہے گا۔ شکایتیں ہیں کہ ختم نہیں ہو رہی ہیں۔ تو نے ہم سے ہماری آزادی چھینی، ہمارا بچپن چھینا، ہمیں علم سے بیزار کر دیا، ہمارا وجود اسکول، ہوم ورک، پروجیکٹس، اور ٹسٹ میں پھنس گیا جس کی وجہ سے ہم کھل کر سانس بھی نہیں لے پا رہے۔ اب اتنا ہی پوچھنا ہے کہ ”اے اسکول! بچے کی جان لو گے کیا؟“

■

Nazneen Firdose
H.No. 8-15-70/3/1, Mohammadia Colony
Vattepally, Falaknuma
Hyderabad 500053 (Telangana)

ع امیر

امتحان کی تیاری کیسے کریں؟

امتحان کے نام سے عموماً چھوٹے بڑے سب ہی گھبراتے ہیں، لیکن اگر تھوڑی سی ہوشیاری اور یکسوئی سے کام لیا جائے تو امتحان کے بھوت پر آسانی سے فتح حاصل کی جا سکتی ہے۔ امتحان میں پاس ہونا بہت زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ اگر امتحان کی تیاری ڈھنگ سے کی جائے تو پاس ہونا تو الگ رہا، اچھے نمبروں سے امتیازی حیثیت بھی پانا کوئی مشکل نہیں ہے۔

سردیاں ختم ہو چکی ہیں — اور امتحان کے دن نزدیک آتے جا رہے ہیں۔ شروع گرمیوں کے دن پڑھنے اور امتحان کی تیاری کرنے کے لیے بہت مناسب اور موزوں ہوتے ہیں۔ پڑھنے کے لیے صبح اور رات کا وقت زیادہ اچھا سمجھا گیا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ پڑھنے کا مقام بہت پرسکون اور الگ تھلگ ہو۔ جس جگہ زیادہ شور و غل ہو یا ریڈیو وغیرہ بج رہا ہو، وہاں پڑھنا مناسب نہیں۔ ایسے مقامات پر بھی پڑھنا ٹھیک نہیں ہے جہاں توجہ بٹنے کا اندیشہ ہو۔

پڑھائی شروع کرنے سے پہلے آپ ایک ٹائم ٹیبل بنا لیں۔ اس میں تمام کتابوں کے لیے مناسب وقت مقرر کر دیں، اور پھر اسی ٹائم ٹیبل کے مطابق پڑھائی شروع کریں۔

امتحان کی تیاری سے پہلے آپ کے پاس تمام کتابوں کا ہونا ضروری ہے۔ بہت سے طالب علم سوچتے ہیں: فلاں کتاب کی ابھی کیا ضرورت ہے، وقت آنے پر خرید لیں گے۔ لیکن وہ مناسب وقت کبھی نہیں آتا، ہاں امتحان ضرور سر پر آ جاتے ہیں۔ جس طرح جنگ کے میدان میں جانے سے پہلے ایک فوجی اپنے اسلحہ کو جمع کرتا ہے۔ اسی طرح ایک طالب علم کو امتحان کی تیاری کرنے سے پہلے تمام ضروری کتابیں جمع کرنی چاہییں۔

پڑھتے وقت اپنے دماغ کو صرف پڑھائی کی طرف لگائے رکھیے۔ اگر آپ نے دو گھنٹے بھی مکمل توجہ اور یکسوئی کے ساتھ پڑھ لیا تو کافی ہے۔ اس طرح پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں کہ کتاب سامنے ہو اور آپ سوچ کہیں اور رہے ہوں۔ مشہور فلاسفر شاعر گوئٹے نے کہا ہے: ”تم جو بھی کام کرو، اس میں کھو جاؤ۔“

ایک وقت میں مسلسل کئی گھنٹے تک نہ پڑھیے۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کچھ طالب علم پورے سال تو کتاب اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، لیکن امتحان سے کچھ دن پہلے دن رات کتابوں کو چاٹتے رہتے ہیں۔ یہ طریقہ پڑھائی اور صحت دونوں

کے لیے نقصان دہ ہے۔ امتحان کے دنوں میں ضروری ہے کہ آپ جسمانی طور پر مکمل صحت مند رہیں۔ امتحان کے دنوں میں اپنی غذا اور صحت پر بھی پوری توجہ دینا ضروری ہے۔

امتحان کے دنوں میں یہ بھی ضروری ہے کہ طالب علم میں لکھنے کی اہمیت ہو۔ وہ اپنے مطلب کو کم سے کم الفاظ میں بیان کرنے یا لکھ سکے۔ لکھنے کا انداز سلیس اور لکھائی خوش خط ہونی چاہیے۔ آپ کے لکھنے کی رفتار بھی تیز ہونی چاہیے۔

امتحان کی تیاری میں آپ گیس پیپرز سے بھی مدد لے سکتے ہیں لیکن صرف گیس پیپرز کے سہارے امتحان دینا عقل مندی نہیں ہے۔

امتحان سے پہلے رات کو زیادہ دیر تک پڑھنے کی عادت نہ ڈالیں۔ کم سے کم چھ سات گھنٹے کی نیند ضرور پوری کریں۔ صبح کو بھی امتحان دینے سے پہلے پڑھائی چھوڑ دینی چاہیے۔ تازہ دماغ کے ساتھ امتحان دینا زیادہ سود مند ہے۔

امتحان دینے کے لیے ضروری چیزیں — جیسے قلم دوات وغیرہ پہلے سے تیار کیجیے۔ گھبراہٹ میں کوئی ضروری چیز بھول جانے کا دماغ اور ذہن پر برا اثر پڑتا ہے۔

امتحان ہال میں پورے اعتماد کے ساتھ جائیے۔ اپنی امتحان کی کاپی پر اپنا نام وغیرہ صاف لکھیں، اور خیال رکھیں کہ اس میں زبان وغیرہ کی کوئی غلطی نہ ہو۔

امتحان کا پرچہ ملنے پر آپ سب سے پہلے تمام سوالات کو پڑھ لیں۔ آپ کو کتنے سوال کرنے ہیں، اور کون سا سوال پہلے کرنا ہے، یہ سب بہت سکون سے سوچیے۔ سب سے پہلے وہی سوال کیجیے جو آپ کو بہت اچھی طرح آتا ہو۔ آپ کا جواب غیر ضروری طور پر لمبا نہیں ہونا چاہیے اور نہ اتنا چھوٹا کہ بات سمجھ میں نہ آئے۔ جواب لکھتے وقت یہ دھیان رکھیں کہ کاپی جانچنے والا اس موضوع کا ماہر ہوتا ہے۔ وہ ان سوالات کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے، اس لیے غلط سلط باتیں نہ لکھیں۔

یہ خیال غلط ہے کہ کاپی جانچنے والا زیادہ لکھنے سے خوش ہوتا ہے اور زیادہ نمبر دیتا ہے۔ کوشش یہی کیجیے کہ وقت ختم ہونے سے پندرہ منٹ پہلے ہی آپ اپنے جوابات پورے کرلیں، تاکہ آپ ایک بار پھر ان کو پڑھ کر ضروری ترمیم و اصلاح کر سکیں۔

ان باتوں کو دھیان میں رکھ کر آپ یقیناً امتحان میں اچھی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ ■

ماخذ: ماہنامہ کھلونا نئی دہلی، نگراں: یوسف دہلوی مدیرہ: الیاس دہلوی، مدیران اعزازی: یونس دہلوی ادریس دہلوی، سنہ اشاعت: مئی 1979

جواب

1	ملک کا صدر	2	چیلنجر ڈیپ	3	1844	4	اشوک چکر
5	اسٹیٹ بینک آف انڈیا	6	اسٹیو جابز	7	مگرمچھ	8	ماجولی جزیرہ
9	ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام	10	جام نگر ریفائنری	11	ہاوڑہ جنکشن	12	تبت
13	Cerebellum	14	Vasopressin	15	کاسمولوجی	16	شنگھائی
17	ریکٹر اسکیل	18	سرایم ویسرایا	19	سینٹرل بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن	20	نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ

گلدستہ

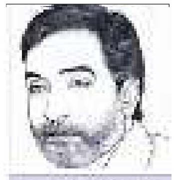

حنفی الہاشمی

ایک ہاتھی، ایک راجہ ایک رانی کے بغیر
نیند بچوں کو نہیں آتی کہانی کے بغیر

مقصود بستوی نے یہ شعر اس وقت کہا ہوگا جب دادیاں اور نانیاں بچوں کو سلانے کے لیے کہانیاں اور لوریاں سنایا کرتی تھیں۔ ان کہانیوں سے بچوں کی آنکھوں میں نیند تو آجاتی تھی مگر یہ کہانیاں بچوں کے ذہنی وجود میں جاگتی رہتی تھیں اور ان کہانیوں کے کردار بچوں کے ذہن میں نقش ہوجاتے تھے۔ لیکن جب سے ہمارا مشترکہ خاندانی نظام بکھراؤ کا شکار ہوا ہے تو رشتوں کے ساتھ ساتھ کہانیاں بھی غائب ہوتی جارہی ہیں اور کہانیوں کے وہ کردار جو ہمارے بچوں کے ذہن کو مستقبل کا لائحہ عمل عطا کرتے تھے وہ بھی گم ہوتے جاتے ہیں۔ پہلے زمانے میں ننھے منے بچوں کو کہانیاں سننے کی ضد ہوا کرتی تھی۔ جب تک کہانی سن نہیں لیتے تب تک سونے کا نام ہی نہیں لیتے۔ جن پری اور راجہ رانی کی کہانیاں سن کر بچوں کے خوابوں کو پر لگ جاتے۔ ایسی کہانیوں میں بچوں کو بہت لطف آتا تھا۔ بچے اپنی دادیوں اور نانیوں سے فرمائشیں کرکے کہانیاں سنا کرتے تھے۔ شاید بچوں کی اسی کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شہریار نے ایک شعر کہا تھا۔

دادی سے کہنا اس کی کہانی سنائیے
جو بادشاہ عشق میں مزدور ہوگیا

یہ محض کہانیاں نہیں ہوا کرتی تھیں بلکہ ذہنی تربیت کا ایک موثر وسیلہ تھیں۔ اب زمانہ بدل چکا ہے۔ بچوں کی ذہنی ترجیحات بھی تبدیل ہوچکی ہیں تو بچے دادی، نانی سے کہانیاں نہیں سنتے بلکہ موبائل فونز پر اپنی پسند کے پروگرام اور کارٹون دیکھتے اور سنتے ہیں اور اسی کی وجہ سے بچے بگڑتے بھی جارہے ہیں۔ دراصل دادی اور نانی ماں کی کہانیاں خواب آور دوائیاں نہیں بلکہ قلب وذہن کے لیے ذہنی اور فکری غذا اور صحت بخش ٹانک کی طرح ہوتی تھیں جن سے بچوں کی شخصیت سازی ہوا کرتی تھی۔ ان کہانیوں میں ایسے ایسے کردار ہوتے تھے جن سے بچوں کو نہ صرف دلچسپی ہوتی تھی بلکہ ان کرداروں کے آئینے میں اپنی زندگی کا عکس تلاش کرتے تھے۔ یہ کہانیاں ہی ان کے مستقبل کے خواب ثابت ہوا کرتے تھے اور بچے انہی خوابوں میں رنگ بھرنے کی ہرممکن کوشش کرتے تھے۔ دراصل کہانیوں کے کردار بچوں کی ذہنی اور جذباتی تشکیل میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں مگر بدلتے وقت کے ساتھ کہانیاں بھی بدل گئی ہیں اور کردار بھی تبدیل ہوچکے ہیں۔ اسی لیے جدید ٹکنالوجی کے اس عہد میں ضرورت ہے کہ بچوں کا رشتہ ان کہانیوں سے جوڑا جائے جو دادیوں اور نانیوں کے ذہنوں سے جنم لیتی تھیں کیونکہ ان میں حقائق و بصائر اور تجربات و مشاہدات کی ایک دنیا آباد ہوتی تھی۔ ان کہانیوں میں ان کے لیے زندگی کے رموز و اسرار بھی ہوتے تھے اور بہت کچھ وہ ہوتا تھا جن کے ذریعے بچوں کو اپنے خوابوں، خواہشوں، تمناؤں اور آرزوؤں کو ایک منزل مل سکتی ہے۔

ڈاکٹر شیخ طاہرہ عبدالشکور کی یہ کتاب 'گلدستہ' بھی کہانیوں کا ایک مجموعہ ہے جس میں بچوں کی نفسیات، جذباتی و ذہنی کیفیات کو خیال رکھتے ہوئے کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔ ان

کہانیوں میں ہماری معاشرت کے بہت سے جیتے جاگتے زندہ کردار ہیں جن کے دکھ درد، الجھنیں، پریشانیاں اور دُکھی چہروں سے روبرو ہوتے ہیں۔ اس میں 12 کہانیاں ہیں، جن میں باتونی گلہری، شرارت یا حماقت، گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں، کارٹون کی دنیا، فوجی، خواہش، اللہ دیکھ رہا ہے، ماں کی نصیحت، روزہ کیوں نہ رکھا؟، کشمش، روٹی کا ٹکڑا، خوبصورت جزیرہ شامل ہیں۔ کہانیاں اس طور پر لکھی گئی ہیں کہ بچوں کے ذہن پر اس کا مثبت نقش قائم ہو۔ ہر کہانی میں کوئی نہ کوئی سبق ضرور ہے جس سے بچے اپنے اخلاق و کردار کو سنوار سکتے ہیں اور اپنے مستقبل کو بہتر سے بہتر بنا سکتے ہیں۔ یہ Virtue ethics پر مبنی کہانیاں ہیں۔ تاکہ بچے منفی افکار و اقدار سے بچ سکیں اور ان کے اندر صالح قدریں (Moral excellence) پیدا ہو سکیں۔ کہانیوں کی تشکیل میں جو الفاظ/جملے/فقرے وغیرہ استعمال کیے گئے ہیں وہ بھی مقصدیت اور معنویت سے معمور ہیں۔ کہانی کے عنوانات بھی افادیت کا تعین کرتے ہیں۔ ان کہانیوں میں مختلف اور متضاد کرداروں کے حوالے سے ذہن میں یہ بات نقش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اپنی ذات کے اندر کس طرح کی صفات پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر بچوں کی شخصی زندگی سے متعلق جو مسائل ہیں انھیں سہل اور سادہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہانیاں مختلف نوعوں کی ہیں اور یہ تمام رنگ بچوں کے لیے بہت دلچسپ اور جاذب قلب و نظر ہیں۔ ڈرامے کے ذیل میں بھی اچھے ڈراموں کا انتخاب کیا گیا ہے اور بچوں کو مکالماتی انداز میں زندگی کے نشیب و فراز اور مد و جزر اور کائنات کے احوال و حوادث کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ پاگلوں کی انجمن ایک اچھا طربیہ ڈراما ہے۔ اس میں کئی کردار ہیں۔ رپورٹر، نرس، شاعر وغیرہ۔ دیکھیے کس طرح شاعر کے کردار کو پیش کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

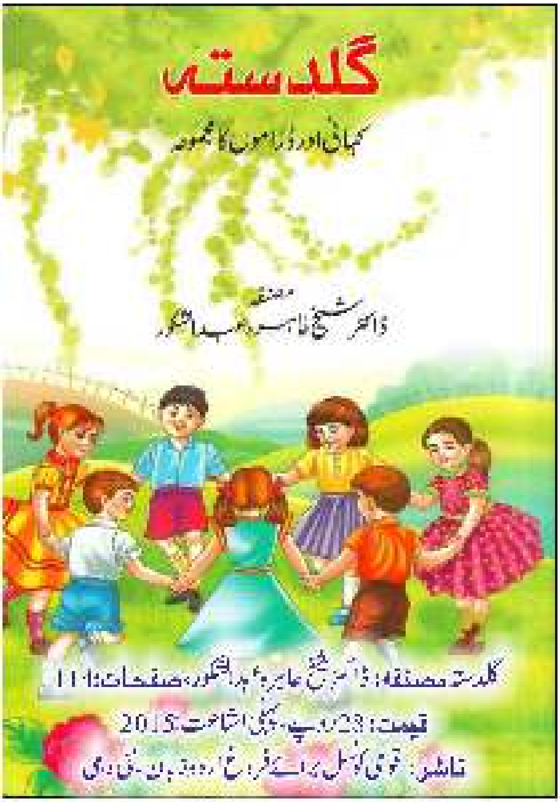

خون چوسا مہنگائی نے
سولی پہ چڑھایا بکتی کی سکائی نے
نوکری ملنے نہ دی رشوت نے
شاعری کرنے نہ دی قسمت نے
پھر بھی میں ایک شاعر ہوں
نئے زمانے کا کافر ہوں

ایک دیا جلائے رکھنا عمدہ اور سبق آموز ڈراما ہے۔ اس ڈرامے کا کردار احمد ایک محنتی لڑکا ہے جن کے ابا کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اس کے معاشی حالات بہتر نہیں ہوتے تو وہ چھوٹی موٹی نوکری کے لیے سوچتا ہے مگر نیک طینت ماں اس کی تعلیم پر زور دیتی ہے۔ وہ ڈاکٹر یا انجینئر بننے کے لیے محنت مزدوری بھی کرنا چاہتا ہے لیکن ماں رات دن محنت کرکے اس کی تعلیم کا انتظام کرتی ہے۔ اس کی ایک بہن صبیحہ بھی ہے۔ بہن کی

مگر جب اسے پتا چلتا ہے تو وہ ماں کی ذمے داریوں کو بانٹنا چاہتا ہے۔ لیکن ماں کام سے منع کر دیتی ہیں۔ امجد محنت کرکے کامیاب انجینئر بن جاتا ہے اور ایک کمپنی میں اسے ملازمت مل جاتی ہے۔ اس موقعے پر وہ اپنے استاد کے پاس جاتا ہے جنھوں نے مشکل وقت میں اس کی مدد کی تھی۔ وہ اپنے استاد کی طرف ایک پیکٹ بڑھاتے ہوئے کہتا ہے کہ سر یہ آپ کی امانت تھی، وہی آپ کے پاس لوٹانے آیا ہوں۔ پھر دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوتی ہے یہ واقعی بہت سبق آموز اور بصیرت افروز ہے۔ ذرا یہ مکالمہ ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کتنے خوبصورت انداز میں کسی ضرورت مند کی مدد کی تحریک اور ترغیب دی گئی ہے۔

عرفان سر: امجد میں نے تمھیں وہ قرض سمجھ کر نہیں دیے تھے۔ رکھ لو مجھے نہیں چاہیے۔

امجد: سر آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ میں آج اس قابل ہوں کہ وہ لوٹا سکوں۔ یہ تو صرف ایک رقم ہے جو میں لوٹا دوں گا مگر آپ کے خلوص اور محبت کا احسان ساری عمر بھی میں نہیں اتار سکتا۔

عرفان سر: کوئی کسی پر احسان نہیں کرتا بیٹے، یہ ہم سب کا وہ فرض ہے جس سے ہم اکثر غافل رہتے ہیں۔ کبھی اسی طرح کسی نے بھی مجھ پر احسان کیا تھا اور تمھاری طرح جب میں لوٹانے گیا تو پتہ ہے انھوں نے کیا کہا:

امجد: کیا کہا سر؟

عرفان سر: میرے محسن نے کہا تھا یہ تمھارے پاس میرا قرض ہے۔ یہ میں نہیں لوں گا۔ تمھیں یہ قرض اپنے جیسے ہی کسی ذہین اور ضرورت مند طالب علم کو لوٹانا ہے۔ جب میں نے اس دن لائبریری میں تمھاری باتیں سنی تو مجھے لگا میرے قرض لوٹانے کا وقت آگیا اور میں نے تمھارا حق تمھیں دے دیا۔

امجد: سر میں کیا کروں آپ یہ لے لو۔

عرفان سر: یہ تمھارے پاس میرا قرض ہے جب تم بھی کبھی اپنے جیسے کسی ضرورت مند ذہین طالب علم کو دیکھو کہ وہ صرف روپیوں کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم سے محروم ہے تو اس کی مدد کرکے میرا قرض لوٹا دو اور اگر وہ بھی تمھارا قرض لوٹانے آئے تو اسے بھی یہ کہہ کر واپس کر دو کہ وہ کسی کی مدد کریں۔ اسی طرح ہمیشہ ایک دیا امید کا جلتے رہنا چاہیے جس کی روشنی میں کوئی اپنا مستقبل بنا لے۔

'گلدستے' میں خوابوں کو روشنی دینے والی ایسی ہی کہانیاں اور ڈرامے ہیں جنھیں پڑھ کر یقینی طور پر بچوں میں صالح جذبات و احساسات پیدا ہوں گے۔ ڈاکٹر شیخ طاہرہ عبدالشکور نے خوبصورت اسلوب میں یہ کہانیاں تحریر کی ہیں۔ ادب اطفال سے ان کا جذباتی رشتہ ہے اور بچوں سے متعلق موضوعات پر ان کا قلم رواں دواں رہتا ہے۔ معلمی کے پیشے سے وابستگی کی وجہ سے بچوں کی نفسیات، کیفیات اور جذبات سے پوری طرح آگاہ ہیں، اسی لیے انھوں نے بچوں کے ذہنی اور جذباتی تقاضوں کے مدنظر کہانیاں اور ڈرامے تحریر کیے ہیں۔ ان کہانیوں سے یقینی طور پر بچوں کو آداب معاشرت اور اسالیب حیات کو سمجھنے اور اپنے مستقبل کو خوب سے خوب تر بنانے میں رہنمائی ملے گی۔

یہ محض کہانیاں اور ڈرامے نہیں بلکہ یہ بچوں کے لیے جگنو اور ستارے ہیں۔ اگر ان کے ذہن میں ایسی ہی کہانیوں کے چراغ جلتے رہے تو اجنبی اور نامانوس راستوں میں بھی روشنی کا ایک لامختتم سلسلہ ہوگا اور بچے اپنی زندگی کا خوبصورت سفر نہایت سرخروئی اور کامرانی کے ساتھ طے کرتے جائیں گے۔

■

Haqqani Al-Qasmi
H-14S/8, Fourth Floor, Thokar No : 8
Shaheen Bagh, Jamia Nagar
New Delhi- 110025
Mob : 9691726444

احرار حسین

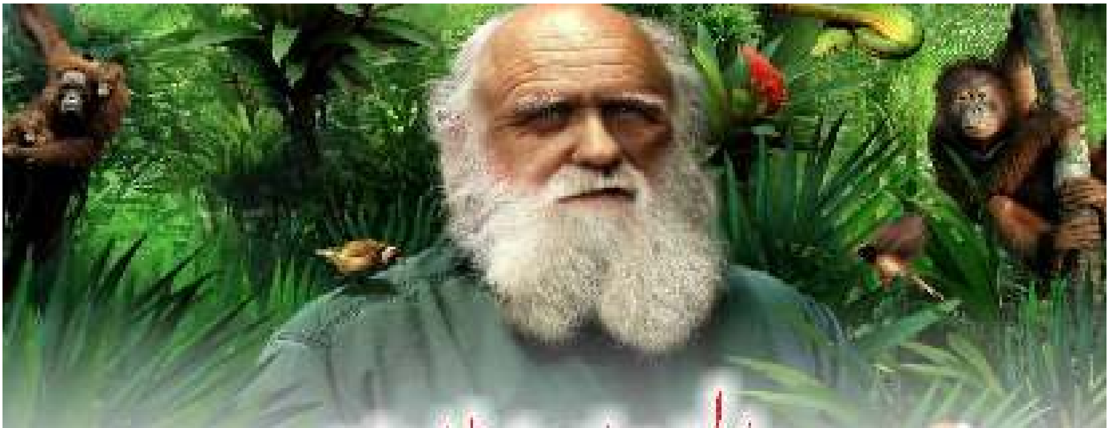

چارلس رابرٹ ڈارون

ڈارون 12 فروری سنہ 1809 میں لندن کے شروز بوری شہر میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک مالدار زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد رابرٹ وارنگ اپنے زمانے کے مشہور اور کامیاب معالج تھے۔ اس طرح ڈارون کی پرورش ایک پڑھے لکھے خاندان میں ہوئی۔ آپ اپنے خاندان میں پانچویں بھائی تھے۔ گھر میں خوش حالی کی وجہ سے ڈارون کی ضروریات اور خواہشات پوری ہوجاتی تھیں۔ ڈارون نے بچپن سے ہی اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ زندگی میں پیش آنے والی ہر انہونی کو بہت گہرائی سے مطالعہ کرتے تھے۔ وہ قرب وجوار میں موجود چیزوں سے لگاؤ رکھتے تھے اور ان کا مشاہدہ کرتے تھے۔ ڈارون اپنے مزاج کی وجہ سے خداداد سرمایے کے مشاہدے میں مصروف رہتے تھے۔ ڈارون کے والدان کو اپنے پیشے میں مصروف رکھنا چاہتے تھے جس کے لیے ایڈن برگ یونیورسٹی میں داخلہ کرایا گیا، لیکن ڈارون کی دلچسپی اس شعبے میں نہیں تھی۔ وہ خدا کے بنائے ہوئے پیڑ، پودے اور خربس کے مشاہدے میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ آپ نے کیمبرج یونیورسٹی میں بوٹنی کے شعبے میں داخلہ لیا اور اس میں تحقیقی کام کرنا شروع کیا۔ ڈارون کے اس رویے سے آپ کے والد خوش نہیں ہوئے۔ ڈارون کی دلچسپیوں کو دیکھ کر آپ کے والد کے منصوبوں پر پانی پھرتا نظر آیا لیکن ڈارون اپنے کام میں مصروف رہے۔ والد صاحب نے ڈارون کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا وقت کسی کارآمد کام میں لگائے۔ سنہ 1838 میں ڈارون کا داخلہ کیمبرج یونیورسٹی میں پادری بننے کے لیے کرلیا گیا۔ شاید رابرٹ وارنگ کو یہ نہیں پتہ تھا کہ جس کام میں ڈارون مصروف ہیں وہ ان کو ایک دن دنیا بھر کے صفِ اول کے سائنسدانوں میں لا کھڑا کرے گا۔

کہا جاتا ہے کہ سونے کی پہچان سنار ہی کرسکتا ہے۔ ڈارون کے مشہور کار جان ہینسلو ڈارون کی صلاحیتو ں کو پہچانتے تھے۔ انھوں نے ڈارون کو مشورہ دیا کہ وہ باٹنی میں تحقیق کریں۔ سنہ 1831 میں پروفیسر ہینسلو کی مدد سے انگلینڈ گورنمنٹ نے ڈارون کو بیگل مشن میں شامل کرلیا۔ یہ مشن ڈارون کی زندگی میں ایک اہم موڑ لے کر آیا جس نے ان کو دنیا بھر میں گھومنے کا موقع دیا۔ ڈارون نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ وہ جہاں بھی گئے وہاں پر موجود پیڑ پودے، کیڑے مکوڑے اور جانوروں کے سیمپلس اکٹھے کرتے رہے۔ سنہ 1831 سے سنہ 1836 تک کے اس لمبے سفر میں ڈارون کو

کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان پانچ سال کے دوران ڈارون کے پاس مشاہدے کے لیے اتنا ذخیرہ اکٹھا ہو گیا جس کو گہرائی سے مشاہدے کے لیے کافی وقت درکار تھا۔ ڈارون نے اس پر مشاہدے کے لیے لندن کے ایک خاموش علاقے میں سکونت اختیار کی اور مشاہدہ کرتے رہے۔ تقریباً آٹھ سال کی مسلسل محنت اور لگن کا نتیجہ سنہ 1844 میں سامنے آیا جب انھوں نے نظریہ ارتقا Theory of Evolution پیش کیا۔ آپ نے اخذ کیا تھا کہ دنیا میں زندگی ایک ٹائنی سیلس سے شروع ہوئی تھی اور آج کی زندگی یا شکل ہزاروں سال بعد کی ترمیم اور رد و بدل کے بعد بن پائی ہے۔ ڈارون کو اپنی تحقیق سے یہ خیال آیا کہ ساری انواع کے جانور ایک ساتھ پیدا نہیں ہو سکتے۔ جیل پیگوز جزیرے ابھی چند لاکھ سال قبل ہی وجود میں آئے ہیں اور جو جانور وہاں پائے جاتے ہیں۔ وہ براعظم جنوبی امریکہ سے آئے ہوں گے لیکن یہاں کی لاوا سے بھری مٹی جہاں کیکٹس پودے ہی پیدا ہوتے ہیں اور سخت گرمی کے باوجود جانور وہاں کے ماحول آب و ہوا اور غذا کے امکانات کے تحت لاکھوں سالوں میں اس طرح بدل گئے جیسے دنیا کے تمام حصوں میں موسم کے حساب سے تبدیل ہوتے رہے ہوں گے اور وہ جانور اور پودے جو موسم کے حساب سے بدل نہ سکے۔ وہ اس دنیا سے ناپید ہو گئے۔

ڈارون کا مشاہدہ بہت اہم تھا اور سیدھا سادہ بھی۔ (Naturl Selection) (نیچرل سلیکشن) کے بارے میں ڈارون کا نظریہ سیدھا اور اہمیت کا حامل تھا۔ مثلاً ایسے جانور جیسے کچھوے کے سارے بچے یکساں نہیں ہوتے۔ ان میں ایک وہ بچے ہوں گے جن کی گردنیں اوروں سے لمبی ہوں گی۔ قحط اور خشک سالی میں یہ بچے درختوں پر لگی۔ وہ پتیاں بھی کھا سکتے ہوں گے، جو کچھ اونچائی پر لگی ہوں گی۔ باقی بچے نیچے لگی، پتیوں کو ہی کھا سکے ہوں گے۔ جب نیچے لگی پتیاں ختم ہو گئیں تو چھوٹی گردن والے بچے ختم ہو گئے، لیکن لمبی گردن والے بچے بچ گئے اور ان جانوروں کے بچے بھی لمبی گردن والے ہی پیدا ہوئے اور پھر ان کی ہی نسل چلتی رہی اور لاکھوں سال کے بعد بھی ایسی ہی نسلیں رہ گئیں جن کی گردنیں لمبی تھیں۔ اس مرحلے کو ڈارون نے فطری انتخاب کا نام دیا۔

ڈارون نے سنہ 1895 میں ابتدائی انواع کے نام سے کتاب شائع کی تھی، لیکن سائنسی برادری نے ڈارون کے ان نظریات کو شک و شبہے کے نظر سے دیکھا۔ ڈارون نے سروایول آف دی فیٹسٹ (Survival of the Fittest) نظریہ بھی پیش کیا۔ ڈارون کا کہنا تھا کہ وہ حیوانات جو اپنے ماحول کے ساتھ اپنے آپ میں رد و بدل کر سکے تھے۔ وہ دنیا میں آج بھی موجود ہیں۔

وہ جو حالات کے ساتھ نہ بدل سکے وہ فنا ہو گئے۔ اس کی سب سے بہتر مثال ڈائناسور کی دی جا سکتی ہے۔ اس نظریے کو ڈارون نے نیچرل ایلی مینیشن کہا۔ ڈارون نے دی ڈیسینٹ آف مین موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی۔

ڈارون نے اپنی پوری زندگی تحقیقی کاموں میں ہی مصروف رکھی۔ سنہ 1850 کے زمانے میں سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ ایسے حالات میں ڈارون کی کوشش اور تحقیقی مشاہدے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ڈارون کو دنیا کے صف اوّل کے سائنسدانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ سنہ 1882 میں 73 سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ ان کی سائنس کی خدمات کو سراہتے ہوئے لندن کے ہال آف نیچرل ہسٹری میوزیم میں ماربل کا مجسمہ نصب کیا گیا جو ہمیشہ ان کی یاد دلاتا رہے گا۔

■

ماخذ: عظیم سائنسداں، **مصنف:** احرار حسین، **سنہ اشاعت:** 1998، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

تاریخی، سائنسی اور ثقافتی معلومات

معلومات عامہ بچوں کے لیے بہتر اور مستقبل سازی کے لیے بہت ضروری ہے۔ جنرل نالج پوری دنیا سے جوڑنے کا ایک مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ اسی کے ذریعے مقابلہ جاتی امتحانات میں کامیابی کے دروازے کھلتے ہیں، اس لیے بچے اگر ابھی سے تاریخ، ادب وثقافت، سماج اور سائنس کے موضوعات اور معلومات پر اپنی توجہ مرکوز کریں تو مستقبل میں ان کے لیے راہیں آسان ہو جائیں گی۔

1. یونین ٹیریٹوریز کا سربراہ کون ہوتا ہے؟
2. سمندر کے سب سے گہرے حصے کو کیا کہتے ہیں؟
3. اسماعیل میرٹھی کب پیدا ہوئے؟
4. ہندوستان کا قومی نشان کیا ہے؟
5. SBI کا فل فارم کیا ہے؟
6. ایپل موبائل فون کا بانی کون ہے؟
7. دنیا کا سب سے بڑا رینگنے والا جانور کون سا ہے؟
8. ہندوستان میں میٹھے پانی کا سب سے بڑا جزیرہ کون سا ہے؟
9. میزائل مین آف انڈیا کے نام سے کون جانا جاتا ہے؟
10. ہندوستان میں سب سے بڑی آئل ریفائنری کون سی ہے؟
11. ہندوستان کا سب سے بڑا ریلوے اسٹیشن کون سا ہے؟
12. دریائے برہمپتر کہاں سے نکلتا ہے؟
13. آنکھوں اور کانوں کے اعصاب کس چیز سے جڑے ہیں؟
14. کون سا ہارمون انسانی جسم میں بلڈ پریشر کو کنٹرول کرتا ہے؟
15. کائنات کے مطالعے کو کیا کہا جاتا ہے؟
16. دنیا کی سب سے بڑی بندرگاہ کہاں واقع ہے؟
17. زلزلے کی شدت کو ناپنے کے لیے کیا استعمال کیا جاتا ہے؟
18. ہندوستان میں کس کی سالگرہ کو انجینیئر ڈے کے طور پر منایا جاتا ہے؟
19. CBSE کا فل فارم؟
20. NCERT کا فل فارم؟

(جواب صفحہ نمبر 52 پر ملاحظہ فرمائیں)

جویریہ آرزو فردوس، درجہ ششم، ضلع پریشد اردو لڑکیوں کی مدرسہ جوہوا
تعلقہ جالنا ضلع جالنہ، مہاراشٹر

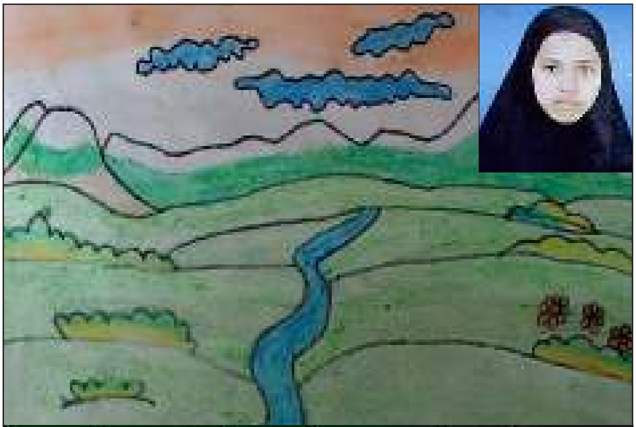

عائشہ فاطمہ روشن شیخ، درجہ ہشتم، محمد شریف سوداگر میموریل ہائی اسکول، دستی گنج، مہاراشٹر

عالیہ قیصر، درجہ پنجم، اکشت ہائی اسکول، بسفی، مدھوبنی، بہار

تہذیب انصاری، درجہ ششم
وشال بھارت ایجوکیشن سوسائٹی کی اردو پرائمری اسکول، پونے، مہاراشٹر

طوبیٰ علی بنت سعد علی، درجہ ہشتم، ادارہ کے اسکول، شاہین باغ، نئی دہلی

لطیفہ قریشی، درجہ ہفتم، محمد شریف سوداگر میموریل ہائی اسکول، دستی گنج، مہاراشٹر

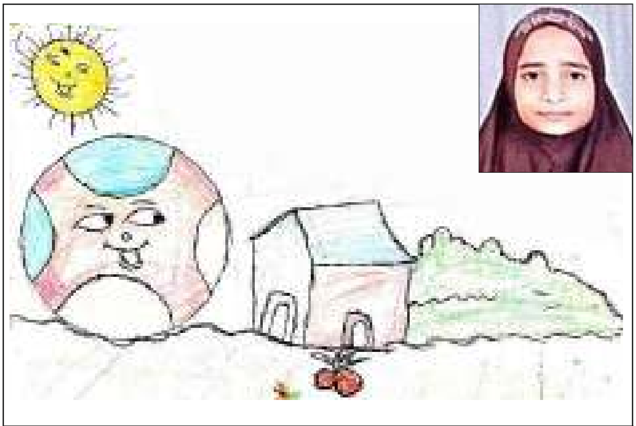

عالیہ شیرے بیجاپوری، درجہ چہارم، ضلع پریشد اردو اسکول اسرے، ساکری، ضلع دھولیہ، مہاراشٹر

راشدہ خاتون بنت عبدالوہاب، درجہ پنجم
اپ گریڈ مڈل اسکول، بیجاپور، مظفر پور، بہار

ہبہ انجم رحمانی، درجہ سوم، ڈی اے وی پبلک اسکول، رانچی، جھارکھنڈ

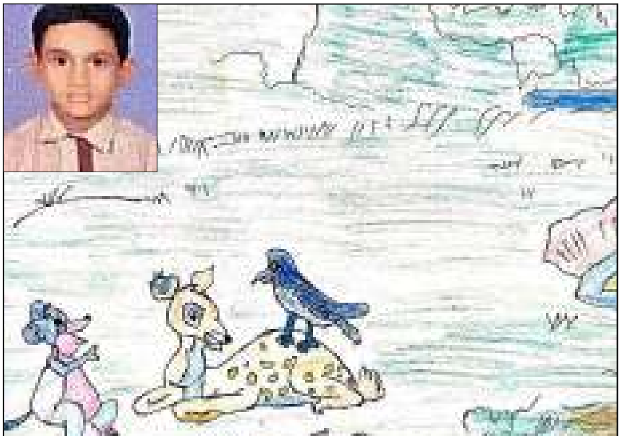

عمر شریف جیلدار، درجہ ششم، زیڈ پی اردو اسکول، کسمادے، مہاراشٹر

صحیٰ محمد جاوید دلے، درجہ ششم (ن)، ڈاکٹر فقراللہ ... اسکول و جونیئر کالج، شولاپور، مہاراشٹر

نشمی آفرین محمد علیم، درجہ دہم، نورجہاں گرلز ہائی اسکول
حریری ... مدھیہ پردیش

محمد زید حسین، درجہ ششم، بی۔ بھارتی، مہر منزل روڈ، ... کولکاتہ، مغربی بنگال

عزیٰ، دارالہدیٰ، کچھوچھہ، مہاراشٹر

عالیہ، درجہ اول، الفی پبلک اسکول، ارریہ، مدھوبنی، بہار

فردوس، ... احمد انصاری، ... اردو گرلز سیکنڈری اسکول، ... مہاراشٹر

زیبا انجم الہدیٰ، درجہ ششم، ڈی پی ایس ای پبلک اسکول، گوپال گنج، بہار

عبدالرحمٰن ابن میر چودھری، درجہ ششم، ... اسکول، اورنگ آباد، مہاراشٹر

مشعل افروز، درجہ ہفتم، مولانا آزاد اردو ہائی اسکول، اوروائی، بہار شریف

تفہیمہ فیاض، درجہ دوم، ماڈرن پبلک اسکول، سالیا، اننت ناگ، کشمیر

شیخ خوشنما بنت تصور خوشنو، درجہ دوم، پرانی منصفی، دربھنگہ، بہار

بشریٰ جہاں، دہلی پبلک اسکول، پاکڑی پوٹ، اڈیشہ

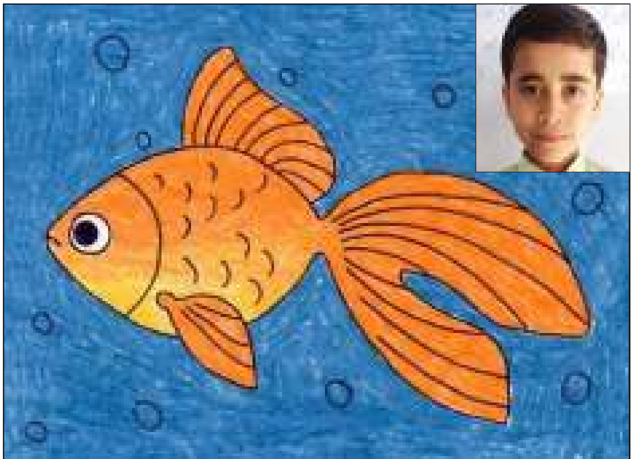

محمد حمزہ احسان، درجہ پنجم، ضیا ماڈرن انگلش اسکول، روا پارہ، دسٹ مشرقی چمپارن، بہار

ثنا افروز، درجہ پنجم، اقرا ماڈرن انگلش اسکول، غازی آباد، یوپی

قلمکاروں سے چند باتیں

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' ایک مقبول رسالہ ہے جس میں بچوں کے ذہن اور نفسیات کو نظر میں رکھتے ہوئے معلوماتی مضامین، دلچسپ کہانیاں، پیاری پیاری نظمیں اور دیگر مفید تحریریں شائع کی جاتی ہیں۔ اس رسالے میں کوشش کی جاتی ہے کہ پورے ہندوستان کی نمائندگی ہو مگر بسیار کوشش کے باوجود بہت سے علاقوں کی متناسب نمائندگی نہیں ہو پاتی ہے۔ ایسے علاقوں کے ادیبوں کی جستجو ہماری ترجیحی فہرست میں شامل ہے۔

- رسالے میں بچوں کے ادیبوں کے تعارف اور تصویر کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے تاکہ بچوں کے ادیبوں کی ڈائرکٹری ترتیب دینے والوں کو مدد مل سکے۔
- معلومات عامہ، صحت، زبان شناسی، تاریخ، تہذیب، سائنس و ٹیکنالوجی، جغرافیہ، آثار قدیمہ اور اہم شخصیات سے متعلق تخلیقات ترجیحی طور پر شائع کی جائیں گی۔
- 'مستقبل کے قلمکار' عنوان کے تحت بچوں کی تحریروں کو خاص طور پر شائع کیا جائے گا۔
- بچوں کے ادیبوں کے انٹرویوز اور رسائل کے مدیران پر ایک سیریز شروع کی جائے گی۔

قلمکاروں سے گذارش ہے کہ بچوں کی دنیا کے لیے تحریریں بھیجتے وقت درج ذیل امور کا خاص خیال رکھیں:

- بچوں کے لیے صرف وہی تخلیق ارسال کریں جس سے ان کی معلومات اور آگہی میں اضافہ ہو، خاص طور پر وہ تحریریں جو بچوں میں مطالعے کی تحریک اور ترغیب پیدا کریں۔
- تخلیق کی زبان آسان ہو، مشکل الفاظ سے گریز کریں تو بہتر ہوگا۔
- تخلیق غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلّے میں ارسال نہ کی گئی ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 1200 (بارہ سو) الفاظ سے کم اور 2000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون کے ساتھ اپنا تعارف مع تصویر ارسال فرمائیں۔ تعارف میں بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں اور مضامین کا اندراج ضرور فرمائیں۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- تخلیق کی اشاعت کے درمیان کم سے کم تین (3) ماہ کا فاصلہ لازمی ہے۔ اس سے کم مدت میں تخلیق کی اشاعت کے لیے اصرار نہ فرمائیں۔
- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری اڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کو زیادہ مفید مطلب بنانے کے لیے آپ سب کے مشوروں اور تعاون کی ضرورت ہے۔

—ادارہ

बच्चों की दुनिया मासिक, अप्रैल 2024, वर्ष 12, अंक 04
BACHON KI DUNIYA Monthly, April 2024 Vol. 12, Issue: 04
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439/2022-24
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/03/2024
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

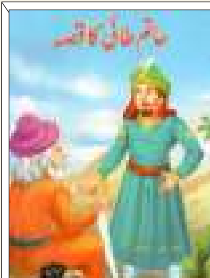
صفحات: 86 ، قیمت: 30 روپے

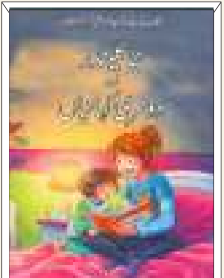
صفحات: 43، قیمت: 15 روپے

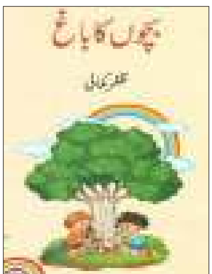
صفحات: 50، قیمت: 20 روپے

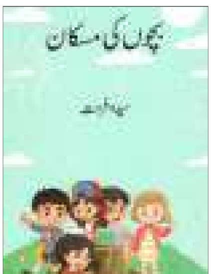
صفحات: 64، قیمت: 25 روپے

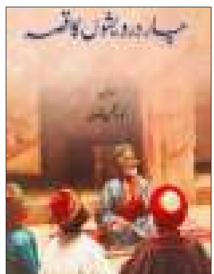
صفحات: 70، قیمت: 30 روپے

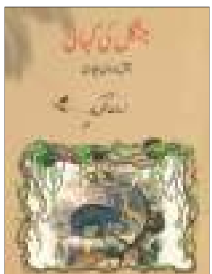
صفحات: 118، قیمت: 30 روپے

صفحات: 108، قیمت: 95 روپے

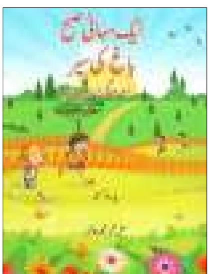
صفحات: 101، قیمت: 35 روپے

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Dhananjay Singh, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6